جلد ۶ عدد ۳

ربیع الاول ۱۳۵۴ھ

رجسٹر نمبر آصفیہ (۱۲۰)

رجسٹر نمبر ایم ل (۳۹۵۰)

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی وحقایق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ)

قیمت فی پرچہ ۸ ـر

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کیے ہیں اُن میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے۔ اس مسئلے پر ایسی شد و مد کے ساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہوگئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لئے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع و برید شروع کردی۔ اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی۔ مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کردیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول و قوانین جنگ سے مقابلہ کرکے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد و ضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب بودھ مت مسیحیت یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آگئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لئے بالکل نئے ہیں عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب نہ صرف اردو بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت (۵۰۰) صفحات قیمت بلا جلد (سعہ) انگریزی (للعہ) سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت صہ انگریزی للعہ سکہ عثمانیہ)

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے (یہ کتاب مکتبہ علمیہ چار مینار سے بھی مل سکتی ہے)

فہرست مضامین

ماہ ربیع الاول ۱۳۵۴ھ۔ جلد (۶)۔ عدد (۳)

اطلاع

دفتر ترجمان القرآن اب خیریت آباد سے منتقل ہوکر بدرالدین بلڈنگ۔ نظام شاہی روڈ چلا گیا ہے۔ لہذا آیندہ مراسلت اسی پتہ پر کی جائے

منیجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

"ایک دو سال کا خوبصورت بچہ بخار اور درد قولنج میں مبتلا تھا۔ اس کی تکلیف اور اضطراب کو سخت سے سخت دل انسان بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ رفع تکلیف کے لیے کبھی وہ اپنے ماں باپ کی طرف دیکھتا اور کبھی ڈاکٹر کے سامنے کڑوی کسیلی دوا کے لیے منہ کھولتا۔ اسی تکلیف میں ایک دن رات رہ کر وہ ہمیشہ کے لیے اپنے ماں باپ سے رخصت ہو گیا۔ اس کو کرب اور نزع کی حالت میں دیکھ کر دل میں سوال پیدا ہوا کہ رب رحیم و کریم جو رافت اور شفقت کا منبع ہے، چھوٹے اور معصوم بچوں پر مصائب اور تکالیف کیوں وارد کرتا ہے؟ حالانکہ وہ خود کہتا ہے کہ مَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ۔ اس میں شک نہیں کہ معصوم بچے لیے صابر ماں باپ کے لیے قیامت کے دن شافع اور موجب ثواب ہوں گے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان کو یہ تکلیف کس پاداش میں ملی اور وہ دوسروں کے فائدے کے لیے خود کیوں مصائب میں مبتلا ہوں؟ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔"

یہ ایک کرم فرما کے خط کا اقتباس ہے۔ جو سوال ان کے دل میں پیدا ہوا ہے، قریب قریب وہی سوال مختلف صورتوں میں ہر ایسے موقع پر لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے، جب وہ موت، اور بیماری، اور نزول آفات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ وباؤں میں ہزاروں آدمیوں کا انتہائی بے کسی کی موت مرنا، زلزلہ میں ہزارہا گھروں کا تباہ ہونا، سیلاب میں لوگوں کا بے اندازہ مصائب و شدائد سے دوچار ہونا، مختلف قسم کی موذی بیماریوں میں لوگوں کا سخت کرب و اذیت کے ساتھ تڑپنا، غرض مصیبت اور درد و الم کا نظارہ انسان کے دل میں آپ سے آپ یہ سوال پیدا کر دیتا ہے کہ وہ خدا جو رؤف اور رحیم ہے، اور وہ خدا جو اپنی ربوبیت اور اپنے کرم و فضل پر ناز رکھتا ہے، اور وہ خدا جو خود کہتا ہے کہ میں ظالم نہیں ہوں، آخر اپنے بندوں پر یہ سختیاں کیوں نازل کرتا ہے؟ اور خود اپنی ہی بنائی ہوئی مخلوق کو جسے خود اسی نے درد و الم کا احساس دیا ہے، اس طرح مصائب و آلام میں کس لیے مبتلا کرتا ہے؟ بعض لوگ تو اس مسئلہ میں یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ قہر خداوندی کے ان آثار کو حق تعالیٰ کی صفت رافت و رحمت کے منافی سمجھنے لگتے ہیں، اور انھیں گمان ہونے لگتا ہے کہ معاذ اللہ خدا ایک اندھی طاقت (Blind force) ہے جس کو کسی کی راحت و اذیت کا کچھ علم نہیں۔ وہ یوں ہی بلا کسی علم کے بنانے اور توڑنے پھوڑنے میں مشغول ہے۔

جن لوگوں نے کائنات کے نظم اور ملکوت ارض و سماء پر غور کیا ہے وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کائنات علیحدہ علیحدہ مستقل الوجود اجزاء پر مشتمل نہیں ہے بلکہ وہ ایک کل ہے جس کے تمام اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں، اور زمین کا ایک ذرہ مریخ اور عطارد کے ذرات سے ویسا ہی تعلق رکھتا ہے جیسا میرے سر کا ایک بال میرے ہاتھ کے ایک رونگٹے سے رکھتا ہے، گویا پوری کائنات ایک جسد واحد ہے، اور اس کے اجزاء میں باہم ویسا ہی ربط ہے جیسا ایک جسم کے اجزاء میں ہوتا ہے

پھر جس طرح کائنات کے اجزاء میں ربط اور تسلسل ہے، اسی طرح ان واقعات میں بھی ربط و تسلسل ہے جو اس کائنات میں پیش آتے ہیں۔ دنیا کا کوئی چھوٹا یا بڑا واقعہ بجائے خود ایک مستقل واقعہ نہیں ہے، بلکہ تمام کائنات کے سلسلۂ واقعات کی ایک کڑی ہے اور اس کلّی مصلحت کے تحت صادر ہوتا ہے جس کو پیش نظر رکھ کر خداوند عالم اپنی اس غیر محدود سلطنت کو چلا رہا ہے۔ اب یہ امر قابل غور ہے کہ جس شخص کی نظر پوری کائنات پر نہیں بلکہ اس کے ایک ایسے حقیر حصے پر ہے جس کو کل کے ساتھ اتنی نسبت بھی نہیں جتنی ایک ذرّہ کو آفتاب کے ساتھ ہوتی ہے، اور جس شخص کے سامنے واقعات عالم کا پورا سلسلہ نہیں ہے بلکہ اس سلسلے کی بے حد و حساب کڑیوں میں سے محض ایک دو یا چند کڑیاں ہیں، اور جو شخص کائنات کے اس حقیر حصے اور واقعات کی ان چند کڑیوں میں بھی صرف ظاہری سطح کو دیکھ رہا ہے، باطنی حقائق تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ اس کے پاس نہیں، کیا ایسا شخص کسی جزئی واقعے کو دیکھ کر اس کی حکمت و مصلحت کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے کا اہل ہو سکتا ہے؟ اور اگر وہ کوئی رائے قائم کرنے کی جراءت بھی کرے تو کیا اُس کی رائے صحیح ہو سکتی ہے؟

کائنات کا نظام اور خدا کی خدائی تو خیر اس قدر وسیع ہے کہ اس کے تصوّر ہی سے ہمارا ذہن تھک جاتا ہے لیکن آپ ایک چھوٹے پیمانے پر کسی انسانی سلطنت ہی کو لے لیجیے۔ جو شخص کرسی وزارت یا تخت شاہی پر بیٹھا ہوا ایک بڑی سلطنت کا انتظام کر رہا ہے، وہ بھی اگرچہ ہماری ہی طرح کا ایک انسان ہے، اور فطری استعداد کے لحاظ سے ہمارے اور اس کے درمیان کوئی زیادہ بڑا فرق نہیں ہے، نیز اس کے جتنے معاملات ہیں، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کو سمجھنے اور انجام دینے کی قوت و استعداد ہم میں نہ ہو لیکن محض یہ فرق کہ وہ کرسی حکومت پر سے تمام سلطنت کے نظم و نسق کو دیکھ رہا ہے، اور ہم ایک گوشے میں اس نظم سے بالکل بے تعلق بیٹھے ہوئے ہیں، ہمارے اور اس کے درمیان اتنا

عظیم تفاوت پیدا کر دیتا ہے کہ ہم بالفعل اس کے معاملات کو نہیں سمجھ سکتے، اور اگر کوئی جزئی واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی غایت و مصلحت کیا ہے۔ پھر جب انسان اور انسان کے درمیان محض پوزیشن کے فرق سے اتنا تفاوت واقع ہو جاتا ہے، تو غور کیجیے کہ انسان اور خدا کے درمیان کتنا تفاوت ہوگا۔ درانحالیکہ یہاں محض پوزیشن کا نہیں، حقیقت کا فرق عظیم ہے وہ تمام عالم پر سلطنت کر رہا ہے، اور ہم اس کی سلطنت کے ایک نہایت حقیر گوشے میں بیٹھے ہیں۔ اس کی دانش و بینش سارے عالم پر حاوی ہے، اور ہماری دانش و بینش کی رسائی خود اپنے جسم کی باطنی حقیقتوں تک بھی نہیں۔ اس کی طاقتیں بے پایاں ہیں، اور ہمارے پاس ان میں سے کوئی طاقت بھی نہیں اگر اس تفاوت عظیم کے باوجود اس کے کاموں پر ہم تنقید کریں اور ان کی حکمت و مصلحت کے متعلق کوئی رائے قائم کریں تو کیا یہ تنقید اس تنقید سے کروڑ درجہ زیادہ جاہلانہ نہ ہوگی جو ایک گنوار ایک جھونپڑی میں بیٹھ کر سلطنت برطانیہ کے معاملات پر کرتا ہے؟

اس سے بھی زیادہ واضح ایک اور مثال لیجیے۔ فرض کیجیے کہ آپ ایک باغبان ہیں۔ جو باغ آپ نے بڑی محنت سے لگایا ہے، اور جس کی ترتیب و تزئین میں آپ نے اپنی پوری مہارت صرف کر دی ہے، اس کے درختوں اور پودوں اور بیلوں سے یقیناً آپ کو محبت ہوگی۔ آپ ان کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ ان کو بے ضرورت کاٹنا چھانٹنا یا اکھاڑ پھینکنا آپ کبھی پسند نہ کریں گے اور اگر کوئی غیر آدمی ان پر تیشہ چلائے تو آپ کو سخت ناگوار ہوگا۔ پھر آپ کو علمی طریق سے یہ بھی معلوم ہے کہ نباتات میں بھی راحت اور اذیت، رنج اور خوشی کا احساس ہوتا ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ اگر درختوں اور پودوں پر قینچی یا کلہاڑی چلائی جائے تو ان کو بھی تکلیف ہوتی ہے اور اپنے اعضا کے کٹنے اور اپنے بچوں (پھلوں) سے جدا ہو جانے کا رنج ہوتا ہے لیکن اس محبت اور اس علم کے باوجود آپ بضرورت اور باغ کی کلی مصلحت کا لحاظ کر کے اپنے باغ میں تراش خراش کرتے ہیں، پتیوں اور باغوں کو کاٹتے

چھانٹتے ہیں، پودوں کو تراش کر قلمیں لگاتے ہیں، سبزی کو کاٹ کر ہموار کرتے ہیں، کچے اور پکے پھل حسب ضرورت اتار لیتے ہیں، کِھلے اور بن کِھلے پھول توڑ لیتے ہیں، غیر ضروری پودوں کو اکھاڑتے ہیں، اور سوکھے ہوئے درختوں کو کاٹ پھینکتے ہیں۔ اگر درختوں اور پودوں اور بیل بوٹوں کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ سب کچھ سراسر ظلم ہے۔ اگر ان میں گویائی ہوتی تو وہ کہتے کہ یہ باغبان کیسا بے درد اور ظالم ہے کہ ہمارے اعضاء کی قطع و برید کرتا ہے، ہمارے بچوں کو ہم سے چھین لیتا ہے، چھوٹے چھوٹے پودوں کو جنہوں نے ابھی زندگی کی ایک بہار بھی نہیں دیکھی تھی، اکھاڑ پھینکتا ہے، ننھی ننھی کلیوں کو توڑے جاتا ہے، نہ بوڑھوں کو دیکھتا ہے نہ بچوں اور جوانوں کو۔ بس کاٹنے سے کام ہے، اور کبھی تو ظالم ایک مشین لے کر اس طرح ٹوٹ پڑتا ہے کہ ہماری برادری کے ہزاروں افراد کا بیک وقت صفایا کر ڈالتا ہے۔ کیا ایسا شخص شفیق و مہربان ہو سکتا ہے؟ کیا اس کے دل میں محبت اور رحمت و رافت کے پاکیزہ جذبات ہو سکتے ہیں؟ ہم تو اس کی کانٹ چھانٹ اور اکھیڑ پچھاڑ میں کوئی مصلحت بھی نہیں دیکھتے۔ ہمیں تو یہ ایک اندھا بے حس، سنگ دل وجود معلوم ہوتا ہے جو بغیر کسی علم و حکمت، مصلحت اور غرض و غایت کے کبھی ہم کو پانی دیتا ہے، اور کبھی ہم پر قینچی چلاتا ہے، کبھی ہم کو کھاد بہم پہنچاتا ہے، اور کبھی ہمیں کلہاڑی سے کاٹ پھینکتا ہے، کبھی دوسروں سے ہماری حفاظت کرتا ہے، اور کبھی ہمیں خود اپنے ہاتھوں اکھاڑ ڈالتا ہے، کبھی بیماریوں میں ہمارا مداوا کرتا ہے، اور کبھی خود ایک مشین لے کر ہمارا قتل عام کر دیتا ہے۔

اگر درخت آپ کے انتظام پر یہ نکتہ چینی کریں تو آپ کیا کہیں گے؟ یہی نا کہ ان کی نظر محدود ہے، وہ صرف اپنے وجود اور اپنے قریبی تعلقات کو دیکھتے ہیں، مگر میری نظر وسیع ہے، میں باغ کی کلی مصلحت کو دیکھتا ہوں، وہ صرف اپنے پھل پھول، پتوں اور شاخوں سے دلچسپی رکھتے ہیں،

بہت بڑھے تو اس پاس کے پودوں اور درختوں سے محبت اور ہمدردی کے تعلقات پیدا کرلیے مگر میرے پیش نظر پورے باغ کی بہتری ہے اور میں مجموعی طور پر سب کی صلاح حال کے لیے عمل کر رہا ہوں ہر نادان درخت و بیل اور پودا یہ سمجھ رہا ہے کہ یہ سارا باغ صرف اس کی ذات اور اس کے دوستوں اور عزیزوں کے لیے لگایا گیا ہے اور باغ میں اسی کا مفاد قابل لحاظ ہے لیکن میں نے دراصل ان کو باغ کے لیے لگایا ہے اور انکی ذات سے مجھکو جو کچھ دلچسپی ہے باغ کی خاطر ہے جس حد تک باغ کی بہتری کے لیے مناسب اور ضروری ہے میں ہر درخت اور ہر پودے اور ہر بیل بوٹے کی حفاظت اور پرورش کرتا ہوں۔ مگر جب باغ کی مصلحت متقاضی ہوتی ہے تو میں ان میں کاٹ چھانٹ، تراش خراش، اور اکھیڑ پچھاڑ سب کچھ کرتا ہوں، کیونکہ باغ کا مجموعی مفاد میرے نزدیک ہر پودے اور ہر درخت اور بیل بوٹے کے شخصی مفاد سے زیادہ قیمت رکھتا ہے۔ یہ گمان کرتے ہیں کہ میں دشمنی کی راہ سے ان پر ہاتھ صاف کرتا ہوں، لیکن یہ محض ان کی نادانی اور تنگ خیالی ہے۔ ان میں اتنی صلاحیت نہیں کہ باغ کے معاملات اور اس کے مصالح کو سمجھ سکیں ان کے پاس صرف اپنی تکلیف کا احساس، اور اپنی راحت اور زندگی کی خواہش ہے۔ جب ان کی خواہشات اور احساسات کو صدمہ پہنچتا ہے، تو یہ بے صبر ہو جاتے ہیں اور مجھ پر ظالم ہونے کا شبہ کرنے لگتے ہیں۔ مگر حقیقت ان کے گمان تابع نہیں ہے، ان کے سمجھنے سے میں درحقیقت ظالم نہیں ہو سکتا۔ اور ان کی خاطر میں اپنے باغ کے انتظام کو نہیں بدل سکتا۔

اس چھوٹی سی مثال کو جب آپ پھیلا کر دیکھیں گے تو آپ کو اپنے بہت سے گلوں شکووں کا جواب مل جائے گا۔

کائنات کے نظم پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس زبردست کارخانہ کو بنانے اور چلانے والا یقیناً ایک ایسا وجود ہونا چاہیے جو کمال درجہ حکیم و دانا اور علیم و خبیر ہو۔

جس نے ہم میں خواہشات پیدا کی ہیں، ممکن نہیں کہ وہ ہماری خواہشات سے بے خبر ہو جس نے ہم میں احساسات پیدا کیے ہیں، ممکن نہیں کہ وہ ہمارے احساسات سے ناواقف ہو جس نے بچے کو پیدا کیا ہے، اور بچے کی پرورش کے لیے ماں کے دل میں محبت پیدا کی ہے، وہ ضرور جانتا ہے کہ بیماری اور موت سے بچے کو کیا تکلیف ہوتی ہے اور ماں باپ کے دل کو کیا صدمہ پہنچتا ہے لیکن جب یہ سب کچھ جاننے اور ہم سے زیادہ جاننے کے باوجود اس نے بچے اور ماں باپ کو یہ اذیت دینا گوارا کیا، جب ہمارے احساسات سے باخبر ہونے کے باوجود اس نے ان کو پامال کرنا پسند کیا، جب ہماری خواہشات کا علم رکھنے کے باوجود اس نے ان کو پورا کرنے سے انکار کیا، تو ہم کو سمجھنا چاہیے کہ ایسا کرنا یقیناً ناگزیر ہی ہوگا، اور اس علیم و خبیر کے علم میں اس سے بہتر کوئی دوسری صورت نہ ہوگی، ورنہ وہ اُس بہتر صورت کو اختیار کرتا کیونکہ وہ حکیم ہے، اور حکیم کے حق میں یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ اگر بہتر تدبیر ممکن ہو تو وہ اسے چھوڑ کر بدتر تدبیر اختیار کرے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی حکمتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، اور نہیں آسکتیں، اس لیے کہ ہماری نظر پورے نظام عالم پر نہیں ہے، اور ہم نہیں جان سکتے کہ نظام عالم کے مصالح کیا ہیں، اور ان کے لیے کس وقت کونسی تدبیر ضروری ہے لیکن، اگر اجمالی طور پر ہم اللہ تعالیٰ کی حکمت و دانائی اور اس کے علم کامل پر صحیح اعتقاد رکھتے ہوں، تو ہر آفت کے نزول پر ہم سمجھ لیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اسی کی متقاضی ہوگی، اور اس کے علم میں ایسا ہی مناسب ہوگا، اور ہمارے لیے بجز تسلیم و رضا کے اور کوئی چارہ نہیں۔

پھر ایک دوسری بات جو غور و فکر سے ہم کو معلوم ہوتی ہے، یہ ہے کہ جو ہستی کائنات کے اس نظام کو چلا رہی ہے، اس کی مشیت تمام تر خیر کی ہے، اور اس خیر میں جو امور ہم کو شر اور فساد نظر آتے ہیں، وہ دراصل اعتباری شرور ہیں، یعنی افراد و اشخاص کی طرف قیاس کرتے ہوئے

ان کو شرور کہا جا سکتا ہے، مگر حقیقت میں وہ سب خیر کلی ہی کے لیے ہیں، اور ان کا وقوع دراصل خیر کلی کے حصول کا ایک ناگزیر وسیلہ ہے۔ اگر یہ شرور ناگزیر نہ ہوتے، اور ان کے بغیر خیر کلی کا حصول ممکن ہوتا تو خدائے حکیم و علیم ان کو اختیار نہ کرتا، اور کوئی دوسرا نظام تجویز کرتا۔ خود ہم اپنی کمزوریوں اور نارسائیوں کے باوجود جب گہری نظر سے دیکھتے ہیں تو ہماری عقل حکم لگاتی ہے کہ کائنات کے لیے اس سے بہتر نظام ممکن نہیں ہے، اور کوئی ایسا نظام تجویز نہیں کیا جا سکتا جو ان جزوی و اعتباری شرور سے یکسر خالی ہو بلکہ اگر یہ شرور واقع نہ ہوں تو حقیقت میں ان کا عدم ایک بڑا شر ہوگا، کیونکہ وہ ایک خیر جزئی کی خاطر بہت سے خیرات کے حصول کو روک دے گا۔ مثال کے طور پر موت ہی کو لیجیے جس پر انسان سب سے زیادہ واویلا کرتا ہے۔ ایک شخص کی موت کتنے اشخاص کے لیے زندگی کا راستہ صاف کرتی ہے۔ اگر ایک شخص کو زندگی کا پروانہ دیدیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بہت سے اشخاص پر زندگی کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ اس کی زندگی اگر خیر ہے تو صرف اس کی ذات کے لیے۔ لیکن خیر کلی کے اعتبار سے وہ شر ہوگی بخلاف اس کے اس خاص شخص کی موت صرف اس کے لیے ایک جزئی شر ہے، لیکن یہی شر بہت سے جزئی خیرات کے حصول کا ذریعہ بھی ہے۔ رہا خیر کلی تو اس خاص شخص کے مرجانے سے اس میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا کیونکہ نظام عالم میں اس کی موت سے کوئی خلل نہیں آتا۔

اسی مثال پر قیاس کر کے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اشخاص پر جتنے مصائب نازل ہوتے ہیں وہ سب ایک اعتبار سے شر ہیں، اور دوسرے اعتبار سے وسیلۂ خیر، اور خیر کلی کے لیے ان کا وقوع ناگزیر ہے۔ بسا اوقات ہم خود غور کر کے ان کے وسیلۂ خیر ہونے کی جہت کو سمجھ لیتے ہیں، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تجربہ سے ہم پر ثابت ہو جاتا ہے کہ جس چیز کو پہلے ہم نے شر سمجھا تھا وہ حقیقت میں سبب خیر تھی۔ لیکن اگر کبھی کسی شر کی جہت خیر ہماری سمجھ میں نہ آئے، تب بھی ہم کو مجملاً اس حقیقت پر ایمان رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے بہتر کرتا ہے، اور ہماری خیریت اسی میں ہے کہ اس کی قضا کے آگے سر جھکا دیں

خواہ اس کے فعل کی لِم ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

ہمارے محترم نے جو سوال آخر میں پیش کیا ہے وہ ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ بچے قیامت کے دن اپنے صابر ماں باپ کے لیے موجب ثواب ہوں گے۔ صرف اس لیے کہ ماں باپ نے ان کی موت جیسی مصیبت پر بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، اور قضاء الٰہی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا، اور اپنے ایمان میں فرق نہ آنے دیا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ محض ماں باپ کو یہ فائدہ پہونچانے کے لیے بچوں کو ہلاک کرتا ہے۔ بچوں کی ہلاکت تو خدا ہی جانتا ہے کہ کن حکمتوں اور مصلحتوں کی بنا پر ہوتی ہے۔ البتہ جب وہ واقع ہو جاتی ہے، اور ماں باپ اُس پر صبر کرتے ہیں، تو اس صبر کی جزا ان کو خدا کے ہاں عطا کر دی جاتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی مقصدی تعلق نہیں ہے۔ جیسا کہ سائل نے گمان کیا ہے۔

مقالات

کتب سماوی پر ایک نظر

کتب ہنود

۱۶

از جناب فوقی شاہ صاحب

تاریخ ہنود (بقیہ) ہندو قوم یا ہندو اقوام کے ہند میں داخل ہونے کے متعلق جتنے نظریے مضمون ماقبل میں پیش کیے گئے ہیں ان میں سے ظاہر ہے کہ کوئی ایک ہی نظریہ درست ہو سکتا ہے یا ممکن ہے کہ ایک بھی درست نہ ہو، اور آیندہ کسی مزید علم کی بنا پر کوئی اور نظریہ قائم کیا جا سکے جو بادی النظر میں زیادہ صحیح معلوم ہو۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ یہ سب ظنیات ہیں اور ان کا ہمیشہ اور ہر موقع پر صحیح ہونا لازمی نہیں ہے یہ دور ماقبل تاریخ نکتوبی کی باتیں ہیں جن کی بابت کچھ کہنا گویا تاریکی میں تیر چلانا ہے۔ مذہبی گروہ کے لیے بس ایک امر یقینی ہے کہ یہ سب لوگ انسان ہیں اور ہم اور وہ ایک ہی دادا کی اولاد ہیں۔ زمانہ حال کے بعض محققین کو بھی مذہبی گروہ سے اس معاملہ میں اتفاق ہے۔

الفریڈ رسل والس (۱۸۲۳ - ۱۹۱۳) Alfred Russel Wallace بھی نوع انسان کو ایک ہی نسل سے قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فطری قوانین کے ماورا ایک بالاتر قانون بھی ہے جس کے تحت میں انسان کی دماغی اخلاقی اور روحانی پرورش

وتربیت ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس طرح انسان حیوانات ونباتات پر تصرف کرتا ہے اور انہیں ادنیٰ سے اعلیٰ حالت پر لے جاتا ہے، اسی طرح ایک برتر ہستی کسی مقصد خاص کو پیش نظر رکھ کر انسان کی رہنمائی کرتی ہے، اور انسان کو ایک سمت خاص میں ادنی سے اعلیٰ حالت کی جانب لے جاتی ہے یہ وہی والس ہیں جن کی علمی تحقیقات سے ڈارون نے بہت مدد لی ہے اور جن کی غیر معمولی علمی و محققانہ قابلیت کا اس نے اعتراف کیا ہے مگر اس معاملہ میں ان کی بلندی تک وہ خود نہ پہنچ سکا۔

ڈارون بھی باوجود اپنے نظریہ لنگوریت کے یہ اعتراف کرنے پر مجبور رہا ہے کہ انسان باوجود اختلافات باہمی کے اپنی ساخت اور ذہنی وطبعی خصوصیات میں اس درجہ متحد و مماثل پائے جاتے ہیں کہ وہ سب ایک ہی جد اعلیٰ کی اولاد معلوم ہوتے ہیں۔

سینٹ جارج میوزٹ (۱۸۲۷ - ۱۹۰۰) St. George Mivart) اسی زمانہ کا ایک مشہور سائنس دان اور ماہر علوم حیوانات گذرا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ جسمانی اعتبار سے انسان فطری ارتقار اور روحانی اعتبار سے فوق البشری قدرت سے پرورش پاتا ہے۔

چنانچہ مذہبی گروہ کے صحیح عقیدہ کی رو سے جمیع نوع بشر ایک ہی دادا کی اولاد ہیں اور ہندوستان اس دنیا میں بنی نوع انسان کا سب سے پہلا وطن ہے۔ کیونکہ حسب روایت مشہور ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کا دنیا پر نزول سیلون (یعنی لنکا یا سنگل دیپ) میں ہوا جو کہ ہندوستان کا ایک ٹکڑا ہے۔

جس دور انسانی کا آغاز لنکا سے ہوا وہ طوفان نوح کے وقوع پر ختم ہوگیا۔ بعد از طوفان آدم ثانی یعنی نوح علیہ السلام سے انسانی آبادی کا دوسرا دور شروع ہوا جو اب تک جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ طوفان نوح کا واقعہ صرف قرآن ہی میں نہیں بلکہ توریت مروجہ میں

بھی مذکور ہے۔ چینیوں کی پرانی کتابوں میں بھی درج ہے۔ قدیم یونانی تحریروں میں بھی پایا جاتا ہے۔ زرتشتیوں کی ژند اوستہ میں بھی موجود ہے۔ ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ تقریباً ہر قوم کا قدیم لٹریچر اس طوفان کے وقوع کی شہادت دیتا ہے مختلف بیانات میں جزوی اختلافات تو ضرور پائے جاتے ہیں اور مقامی رنگ ان میں بہت گہرائی کے ساتھ چڑھتے ہوئے ہیں مگر صورت اصلی ان سب کی ایک ہے۔ بارش کی زیادتی اور پانی کے سیلاب سے طوفان کا آنا، ساری مخلوق کا ہلاک ہو جانا، اور ایک شخص سے نسل انسانی کا دوبارہ جاری ہونا اور دنیا کا ازسرنو آباد ہونا جملہ بیانات میں مشترک ہے۔

ہندو لٹریچر میں منو کے متعلق جو واقعات بیان کیے گئے ہیں اُن سے منو پر نوح علیہ السلام کا گمان کیا جاتا ہے۔ رگ وید میں منو کو بنی نوع انسان کا باپ کہا گیا ہے۔ اتھر وا وید میں بھی اس واقعہ کی جانب اشارہ موجود ہے۔ مہابھارت کی تیسری کتاب میں متسیو پاکھیانہ (یعنی مچھلی کا واقعہ) کے نام سے یہ سارا واقعہ بیان کیا گیا ہے جو مختصر یہ ہے کہ ایک چھوٹی سی مچھلی نے منو کو آنے والے طوفان سے متنبہ کیا اور کہا کہ مجھے پال لو اور میں وقت پر کام آؤں گی اور تمہیں طوفان میں تباہی سے بچاؤں گی۔ منو نے اُس مچھلی کو پال لیا۔ رفتہ رفتہ وہ مچھلی بڑی ہوتی گئی یہاں تک کہ بہت بڑی ہو گئی مچھلی کے مشورہ سے منو نے ایک بڑی سی کشتی یا جہاز بنایا۔ جب طوفان آیا تو منو نے اپنے جہاز کو مچھلی سے باندھ دیا اور مچھلی اس جہاز کو کھینچکر جانب شمال لے گئی۔ اور ایک پہاڑ پر ٹھیرا دیا طوفان کے بعد منو کی اولاد سے ساری دنیا پھر آباد ہوئی شتپتھ برہمنان میں بھی یہ واقعہ درج ہے مگر یہاں مچھلی اپنے آپ کو برہما تبلاتی ہے۔ بھاگوت پران میں بھی یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ مگر اس بیان میں منو کو بنی نوع انسان کا باپ نہیں بلکہ خالق کائنات اور دنیا کو ازسرنو پیدا کرنے والا قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ مہابھارت میں صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ منو نے اپنی بیٹی

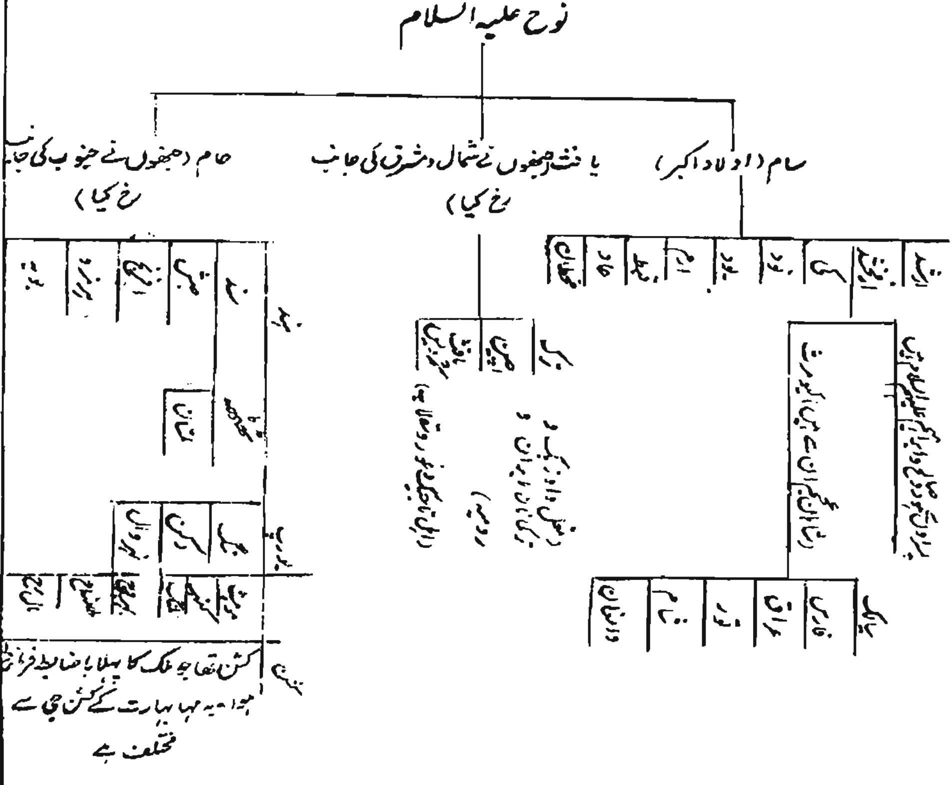
اولاد پیدا کی اور اس اولاد سے تمام دنیا از سر نو آباد ہوئی۔ متسیہ مچھلی کو کہتے ہیں اور متسیہ پران کے نام سے ہندوؤں کے اٹھارہ پرانوں میں سے ایک مستقل پران موجود ہے جس میں یہ واقعہ نہایت شرح و بسط سے درج ہے۔

قرآن مجید کی رو سے نوح علیہ السلام کی کشتی کوہ جودی پر ٹھیری تھی۔ صاحب مجمع البحار کہتے ہیں کہ دجلہ و فرات کے درمیان یہ پہاڑ واقع ہے۔ توریت میں اس پہاڑ کا نام جس پر یہ کشتی ٹھیری کوہ ارارات (Ararat) بیان ہوا ہے۔ اہل کتاب اس پہاڑ کو دجلہ کے مشرق کی جانب کردستانی سلسلہ کوہ میں بتلاتے ہیں۔ اور یورپ کے جدید جغرافیہ دان کہتے ہیں کہ یہ پہاڑ ملک آرمینیہ میں ہے۔ اس کی بلندی سطح سمندر سے ۱۶۹۱۶ فٹ اونچی بیان کی جاتی ہے۔ ہندو لٹریچر میں اُس پہاڑ کا نام جس پر منو کے جہاز نے قرار پکڑا ناؤ بندھنا لکھا ہے مگر شتپتھ برہمنا میں اس کا نام منورا و سرپنہ بتلایا گیا ہے۔ تو گویا دنیا کی آبادی کا دور حاضر اُس مقام سے شروع ہوا ہے۔ جہاں اس طوفان کے بعد کشتی اور کشتی والوں نے قرار پکڑا اور زمین کے مختلف حصوں میں لوگ وہیں سے تقسیم ہوئے۔

یورپ والے ان باتوں کو نہ مانتے ہوں تو نہ مانیں مگر ایسی صورت میں جبکہ ان کے پاس ان قدیم ایام کے متعلق کوئی صحیح معلومات نہیں اور صحیح معلومات حاصل کرنے کا کوئی قابل اعتماد ذریعہ بھی نہیں ہمیں ضرورت ہی کیا ہے کہ ہم ان کے غلط اور مبتدیانہ نظریوں اور طفلانہ ظنیات میں اُلجھے پھریں اور اپنے یقینیات کو متزلزل کر دیں۔ مذہبی لوگوں کے لیے وہ معلومات جو کشف و الہام کے تحت میں حاصل کی گئی ہو بہت زیادہ قابل اعتماد ہے بہ نسبت اُس قصیر العمر رجماً بالغیب کے جو یورپ کے جدت پسندوں کا آج کل حصہ ہے۔

مسلمان مورخوں نے اولاد نوح کے دنیا میں منتشر ہونے کی کیفیت پر خاصی روشنی ڈالی ہے

بوجہ ایک برگزیدہ پیغمبر ہونے کے نوح علیہ السلام کا مسلمانوں کے دلوں میں وہی احترام ہے جو کہ مذہبی ہدایت کے تحت میں ہونا چاہیے اور وہ اسے کبھی پسند نہ کریں گے کہ دیدہ و دانستہ وہ نوح علیہ السلام یا ان کی اولاد کو غلط واقعات کے ساتھ متہم کریں۔ نوح علیہ السلام کے مسکن یا مساکن سے ان کو ایک گونہ قرب مکانی بھی حاصل رہا ہے اور طوفان نوح و ما بعد کے متعلق روایات قدیمہ سے وہ لوگ زیادہ مانوس ہیں۔ پھر مسلمانوں کا ذوق تاریخ بھی مسلّم ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان مورخین کی تحقیقات کو اس معاملہ میں بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ تاریخ فرشتہ میں اولاد نوح کی اس تقسیم کی بابت جو صراحت کی گئی ہے وہ مندرجہ ذیل نقشہ سے بیک نظر مجملاً سمجھ میں آجائے گی۔



مندرجہ بالا نقشہ میں کا ہر شخص جس ملک میں جا کر بسا اس ملک اور اس شخص کی نسل کا وہی نام پڑ گیا یہ طوفان نوح کے بعد کا پہلا نقشہ ہے جس سے آبادیوں کی تقسیم کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اس سے ہند و سندھ و بنگال وغیرہ کی وجہ تسمیہ بھی معلوم ہوتی ہے۔ یہ پہلا نقشہ ہے جس کے بعد لوگوں کی مزید نقل و حرکت سے متعدد اور پیچ در پیچ تبدیلیاں بھی واقع ہوئیں اور نسلیں بھی مخلوط ہوئیں ہندوستان کے قدیم ترین باشندے وہی ہیں جن کی جانب اس نقشہ میں اشارہ ہے نہ کہ وہ جو آسٹریلیا اور جاوا وغیرہ سے آئے ہوئے بیان کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس کبوتر خانہ میں بہت سی قومیں آئیں بعض واپس گئیں اور بعض رہ پڑیں۔ بعض کا کچھ حصہ گیا اور کچھ حصہ رہا۔ ان آنے والی اجنبی قوموں میں سے ڈراویڈین بھی ہیں اور آریہ بھی اور ان کے علاوہ اور بھی۔ فتوحات اسلام سے قبل جو یہاں آئے اور رہ گئے وہ رفتہ رفتہ "ہندو" بن گئے یا کہلائے جانے لگے۔ مگر ان کی بولیاں، ان کے عقائد، ان کے رسوم و رواجات حتیٰ کہ ان کی "ذات" تک میں بہت نمایاں اختلافات رہے اور اب تک ہیں۔

یہ باہر سے آنے والی اجنبی قومیں خالی ہاتھ نہیں آئیں بلکہ غیر ممالک سے بہت سے خارجی اثرات اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ یہ خیال غلط ہے کہ ہندو تمدن ہر لحاظ سے بلا شرکت غیرے ہندی یا ملکی ہے اور بیرونی تمدنوں کا کسی بات میں زیر بار احسان نہیں۔ ناممکن ہے کہ اجنبی اقوام کے ساتھ اجنبی اثرات اس ملک میں داخل نہ ہوئے ہوں۔ اب تک کی معلومات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ کم از کم مصری، بابلی، اسرائیلی، اور ایرانی اثرات بہت کافی حد تک اپنے ہمراہ لے کر آئے اور ان کے مذہب و تمدن و معاشرت میں وہ تمام اثرات راسخ ہو چکے تھے۔

یہ ساری بحث عہد ماقبل تاریخ سے متعلق تھی۔

اب ذرا دور تاریخی پر بھی نظر ڈال لیجئے کہ یہ اجنبی لوگ اس ملک میں آنے کے بعد کن داخلی و خارجی اثرات سے متاثر ہوئے۔

کیا خوب ہوتا اگر ہندو عہد کے واقعات ہندوؤں ہی کی لکھی ہوئی تواریخ پر ہم مبنی کرتے مگر تعجب آمیز افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس نوع کے مواد کا ہندوؤں میں کہیں وجود نہیں پایا جاتا تعجب اس بات پر ہے کہ ہندو (آرین ہوں خواہ ڈراویڈین) اگرچہ اس ملک میں اصلاً اجنبی ہیں مگر بہت عرصہ سے یہاں آئے ہوئے ہیں اور اب اسی برّاعظم میں مقید و محدود ہو گئے ہیں۔ یہاں انھیں بڑے بڑے معرکے پیش آئے، بڑے بڑے مقابلہ انہیں کرنے پڑے، بڑے بڑے سورما اور سیناپتی، مدبّر و سیاست دان، رشی اور منی، پنڈت اور گیانی، موجد اور کاریگر، اور عجیب و غریب قابلیت کے لوگ ان میں پیدا ہوئے، اپنی علمی قابلیت کے اظہار اور دماغی جولانیوں کے لیے انھیں اتنا وسیع میدان ملا، مگر افسوس ہے کہ تحقیق و تنقید و روایت و درایت کے اصولوں کو پیش نظر رکھکر اپنی سرگذشت قلمبند اور اپنے کارنامے محفوظ کرنے کا انہیں خیال تک نہ پیدا ہوا اور ایک بھی کتاب انھوں نے ایسی نہ لکھی جسے صحیح طور پر تاریخ کہا جا سکے۔ اُن کی ساری تاریخ دانی کا دار و مدار مہابھارت پر ہے جو خلاف عقل خلاف قیاس خلاف درایت اور بلا حوالہ اسمائے راویان چند حکایتوں، افسانوں اور کہانیوں کا مجموعہ ہے جس میں نہ واقعات کی ترتیب زمانی کا، نہ اُن کے سنہ و سال کا پتہ چلتا ہے، نہ اِس پوری کتاب کے مصنف یا مصنفین کے متعلق ہندوؤں میں اتفاق ہے، نہ امتیاز ہوتا ہے کہ صحیح واقعہ کہاں ختم ہوتا ہے اور مذہبی حسن عقیدت و اکابر پرستی کہاں سے شروع ہوتی ہے اس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ تاریخ نویسی کا صحیح ذوق اس زمانہ میں دنیا میں پیدا ہی نہ ہوا تھا

اہل یورپ نے بیچارے ہندوؤں پر تان تان کر آوازے کسے ہیں کہ ہندوؤں میں تاریخ نویسی کا مادہ تھا نہ ذوق۔ ہندو لٹریچر میں تاریخی مواد کا مطلق وجود نہیں۔ ہندو عہد کے متعلق تاریخی واقعات کا پتہ چلانا دشوار ہے۔ غلط اور بعید از عقل افسانوں کا نام انھوں نے تاریخ رکھ لیا ہے۔ اگرچہ ہندوؤں کے متعلق اُن کے یہ اقوال درست ہیں مگر ہم اُن سے پوچھتے ہیں کہ دورِ حاضرہ کی عالمگیر

بیداری سے قبل خود اہل یورپ ہی نے کونسی قابل قدر اور قابل وقعت تاریخیں لکھی ہیں جنہیں مستند اور قابل اعتماد سمجھا جا سکتا ہو اور جن پر صحیح معنی میں تاریخ کا اطلاق ہو سکتا ہو۔ پہلے وہ اپنا کوئی کارنامہ پیش کریں اس کے بعد دوسروں کے منہ نہ آئیں۔

اس زمانہ میں یورپ خود جہل کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہاں نہ علم تھا نہ مذہب۔ نہ معقولیت نہ انصاف۔ پادریوں کی نفسانیت و دنیا طلبی و حرص و وجاہت پرستی کا نام مذہب رکھ لیا گیا تھا۔ اُن پادریوں کے مسلک کے خلاف کوئی کہتا تھا یا لکھتا تھا تو مرتد قرار پاتا تھا اور دردناک عذاب سے قتل کر دیا جاتا تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ اُن پادریوں کے ظلم و نفسانیت کا شکار ہوتے رہتے تھے۔ جو کتابیں پادریوں کے خلاف لکھی جاتی تھیں وہ جلادی جاتی تھیں۔ نہ آزادی خیال کا وجود تھا نہ آزادی تقریر کا نہ آزادی تحریر کا۔ ترقی کی راہیں مسدود تھیں جس زمانے میں حق بات کا زبان سے نکالنا ناقابل معافی جرم ہو ایسی تاریخ نویسی کا وجود کیونکر قیاس میں آسکتا ہے؟ اس زمانہ میں اس ملک میں بھی خوش عقیدگی یا خوشامد کی بنا پر اکابر قوم کے حالات مبالغہ آمیز نظم یا نثر میں تصنیف کئے جاتے تھے سنہ و تاریخ کا کوئی اندراج نہ ہوتا تھا۔ ان تصنیف شدہ حالات میں بعد میں بھی گمنام مصنفوں کی طرف سے مزید مبالغہ آمیز اضافے ہوتے رہتے تھے۔ اور صدیوں بعد ان ہی "ظلمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" سے تاریخی واقعات کا استخراج کیا جاتا تھا اور اُن پر تاریخی تصانیف و تالیفات کی بنیاد رکھی جاتی تھی کچھ عرصہ بعد اصلی مصنفین کے وجود میں بھی اختلاف ہو جایا کرتا تھا اور بحثیں چھڑ جاتی تھیں کہ مصنفِ اصلی کا لکھا ہوا حصہ کتنا ہے اور بعد میں اضافے یا تغیرات کیا کیا ہوئے۔

دوسری چیز جس پر اس دور کے تاریخ نویسوں کا دارومدار رہا ہے سیاحوں کے سفرنامے ہیں مگر اُن کا معتبر ہونا بھی یقینی نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں جسے امن و آزادی کا زمانہ

کہتے ہیں جب کہ دخانی جہاز، دخانی گاڑیاں، ہوائی جہاز، موٹر اور دیگر جدید سازوسامان کی بدولت سفر اس قدر آسان ہو گیا ہے، جب کہ اجنبی ممالک میں سیاحوں کے ٹھیرنے کے لیے ہوٹلوں کی آسائش اور حالات ملک دریافت کرنے کے لیے نقل وحرکت کی آسانیاں اور لوگوں سے میل جول پیدا کرنے کے لیے بکثرت کلب اور سوسائٹیاں موجود ہیں، یورپ اور امریکہ سے جو سیاح ہمارے ملک میں آتے ہیں وہ ہمارے ملک کے صحیح حالات سے بیخبر رہتے ہیں۔ اور غلط حالات شایع کرتے ہیں۔ (جس کی ایک جدید مثال مس میو کی کتاب مدر انڈیا موجود ہے) تو بھلا زمانۂ قدیم کے سیاح جنھیں زیادہ مشکلات کا سامنا رہتا تھا۔ ممالک اجنبی کے صحیح حالات سے باخبر ہونے کا کیونکر اہتمام کر سکتے ہوں گے اور آزادی اشاعت کے مفقود ہونے کے زمانہ میں صحیح حالات کی اشاعت کی وہ کیسے تاب لا سکتے ہوں گے؟

یورپ کی موجودہ بیداری جسے (Renaissance) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اُس وقت وجود میں آئی جبکہ آفتاب رسالت عرب میں طلوع ہو چکا تھا، مسلمان اسپین میں آٹھ سو برس تک علم و ترقی کے ڈنکے بجا چکے تھے، مشرق ومغرب کا اتصال جنگہائے صلیبی کے پھریروں کے نیچے عمل میں آچکا تھا اور ترک (۱۴۵۳ء میں) قسطنطنیہ فتح کر چکے تھے، اسپین کی یونیورسٹیاں علم و معقولیت کی شعاعیں یورپ میں پھیلا چکی تھیں۔ قدیم علوم و معقولات کو عربوں نے اپنی بیش بہا تالیفات و تراجم و تفاسیر وحواشی سے عام فہم بنا کر نہ صرف یورپ بلکہ تمام دنیا کے لیے ممکن الحصول بنا دیا تھا اور اس طرح ان مردہ علوم کو از سر نو زندگی بخشدی تھی۔ اجنبی اور غیر اقوام پر عدل و شفقت سے حکومت کرنے کی وہ عدیم المثال روشن دنیا دیکھ چکی تھی جس کی نظیر تاریخ نے نہ اس سے قبل پیش کی نہ اس کے بعد۔

اس Renaissance کا آغاز یورپ میں پندرھویں صدی کے وسط سے تسلیم کیا جاتا ہے جب کہ محمدیوں کو میدان میں آئے ہوئے آٹھ سو برس ہو چکے تھے، اسلامی انعکاس کا

تدریجی اثر محسوس ہونا تو بہت پہلے سے شروع ہو چکا تھا۔ پندرہویں صدی کا وسط دراصل وہ زمانہ ہے جبکہ یہ اثر پوری طرح بھڑک اُٹھا۔

سب سے پہلے اس بیداری کا اثر اٹلی میں ہوا۔ اٹلی سے یہ اثر فرانس اور جرمنی پہونچا۔ ایک عرصہ کے بعد انگلستان کو بھی یہ اثر قبول کرنا پڑا اور سولھویں صدی کے آخر میں جاکر وہاں یونیورسٹیاں وغیرہ قائم ہوئیں۔ اٹلی میں جن لوگوں کی تحریروں نے اس بیداری کو پیدا کیا اُن میں سب سے زیادہ نمایاں شخص ڈینٹے (Dante) تھا جو مسلمانوں کے لیٹریچر سے بڑی حد تک متاثر ہو چکا تھا (Divina Commedia) اُس کی ایک مشہور نظم ہے جو پورے یورپ میں مقبول ہو چکی ہے اور یورپ کی تقریباً ہر زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس نظم میں برزخ و جنت و دوزخ کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مبصرین یورپ اب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ڈینٹے نے اس مشہور نظم میں شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی رح کی مشہور کتاب فتوحات مکیہ کا حرفاً حرفاً اتباع کیا اور اتباع اس قدر تفصیلی اور جزئیات تک میں ہے کہ یورپ کے محققین بھی اسے توارد قرار دینے سے انکار کرتے ہیں۔

اہل یورپ کی مصلحتیں انھیں کسی حق بات کو علانیہ تسلیم نہ کرنے دیں تو یہ ایک جداگانہ امر ہے مگر واقعات ہمیشہ واقعات ہی رہیں گے اور یہ ایک واقعہ ہے کہ مثل دیگر علوم و فنون کے فن تاریخ نویسی میں بھی یوروپین مورخین نے اسلامی مورخین سے سبق پڑھا۔ طرز جدید کی اس محققانہ تاریخ نویسی کے فن کے موجد صرف مسلمان ہی ہیں مسلمانوں کو جو قوی تعلق اپنے مذہب سے رہا ہے اس کی بناء پر انھوں نے روایات مذہبی کی چھان بین اور تحقیق و تنقید و تحفظ کے لیے ایسے عجیب و غریب اصول و قواعد مرتب کیے کہ اس معاملہ میں وہ دنیا میں فرد ہیں اور اس فن تنقید روایات کی مثال دنیا کی کسی دوسری قوم میں نظر نہیں آتی۔ یہ کہنے میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ مسلمانوں کی اس ایجاد سے قبل محققانہ شان کی تاریخ نویسی کا اس دنیا میں وجود ہی نہ تھا۔ نہ کسی نے اس طرف توجہ کی نہ

غالباً اس ضرورت کو محسوس کیا۔ ان حالات میں اگر ہندوؤں نے بھی اس طرف توجہ نہ کی تو ان پر کوئی ایسا الزام عاید نہیں ہوتا جس میں اُن کی دیگر ہمعصر اقوام بھی اُن کے ساتھ شریک نہ ہوں۔

افسوس اس امر کا ہے کہ اہل یورپ نے مسلمانوں سے یہ فن حاصل کرکے بھی کوئی مفید کام اس سے نہ لیا۔ اسے اظہار حق کے لیے وقف نہ کیا بلکہ اپنی محدود ذاتی قومی اور ملکی اغراض کو پیش نظر رکھ کر پروپگینڈا میں وہ اسے صرف کرنے لگے جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ اہل یورپ کی لکھی ہوئی تاریخیں (خصوصاً مشرقی اقوام وممالک کے متعلق) آج اُسی بے اعتمادی کی مستحق ہیں جو حالات عہد ماقبل تاریخ کی تحریروں کے حصہ میں آچکی ہے۔ آج بھی تحریروں پر احتساب ہے منظور شدہ مضامین ہی کے شائع ہونے کی اجازت ملتی ہے۔ فرمانروا گروہ کی اغراض کے خلاف تحریر وتقریر پر یورپ کے ہر ملک میں گرفت ہوتی ہے اور قہر برسایا جاتا ہے ہمیں انھیں امور کا علم ہونے پاتا ہے یا ان امور کا اسیقدر علم دیا جاتا ہے جتنا کہ صاحب اقتدار جماعت کی پالیسی سے ٹکراتا نہ ہو۔ جو قومیں کہ ہم کو اس کی بھی پوری اطلاع نہیں ہونے دیتیں کہ آج ہمارے اردگرد دنیا میں کیا ہو رہا ہے ان اقوام کی تحریری کارستانیوں کی وساطت سے ہم صدیوں قبل کے صحیح واقعات کا علم اطمینان بخش طور پر کیوں کر حاصل کرسکتے ہیں۔

تاریخ کے اس پہلو پر روشنی ڈالنے کی ضرورت یہاں اس لیے پیش آئی کہ ہم اس مضحکہ انگیز نظارہ کو اکثر دیکھتے ہیں کہ آج کل جدید علمی حلقوں کے بعض سادہ لوح یوروپین تحریروں کے ہر رطب ویابس کو آنکھ بند کرکے قبول کرلیتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں غیر اقوام کی تحریروں کو ٹھکرا دیتے ہیں مسلمانوں کی لکھی ہوئی تاریخوں کے اُن واقعات کو جنسے یورپ کو اختلاف ہے بے تکلف غیر معتبر قرار دے دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہم آگاہ کردینا چاہتے ہیں کہ ہماری روش اس کے بالکل برخلاف ہے ہمارے نزدیک جس شخص کا باطن زہد وتقوے وللہیت کی زینت سے جس قدر آراستہ ہوگا اُس کے اقوال اُسی درجہ تصدیق وقبولیت کے مستحق ہوں گے۔ جب تک کہ دنیا کا بڑا حصہ حق تعالیٰ کو اُن

اسماء وصفات کے ساتھ جو اُس کی شان کے شایان ہیں دل سے قبول نہ کریگا صدق و اخلاص وحق بینی وحق پسندی وعدل و امن واطمینان کا تسلط اس جہان میں نہ ہوسکیگا نفس پرستی اور ملک پرستی یہ سب تقلید پرستی ہی کے مختلف نام ہیں جو اطلاق پرستی کی ضد ہے جن تحریروں اور تقریروں اور تاریخوں اور سفرناموں اور رپورٹوں میں ملک پرستی، قوم پرستی، اور اغراض ذاتی و قومی و ملکی کی رنگ آمیزی داخل ہوگئی ہو وہ بغیر کافی تنقید وتحقیق کے ہرگز قابل قبول نہیں ہوسکتیں جن لوگوں کا مذہب سیاست ہو جن کا مقصد زندگی صرف علو فی الارض ہو ان کا کوئی کام سیاسی رنگ آمیزی سے خالی نہیں ہوسکتا اور یہ رنگ آمیزیاں حق کی باطل شکن روشنی کی تاب کسی حالت میں بھی نہیں لاسکتیں۔

اِن ضمنی مگر نہایت ضروری امور پر نظر ڈالنے کے بعد ہم اب اپنے اصلی سلسلہ بیان کی جانب رجوع ہوتے ہیں۔

ہندوؤں کے اس ملک میں آنے کے بعد اُن پر مسلسل حملے ہوتے رہے اور وہ اپنے فاتحوں کے اثرات قبول کرتے رہے۔

ایرانیوں کے بکثرت حملے ہوئے اور ایک مدت دراز تک ہندوستان ایرانیوں کے قبضہ میں اور ایرانیوں کے زیر اثر اور ایران کا خراج گذار رہا۔ مہاراج فرمانروائے ہند شمالی کے عہد میں ایرانیوں نے دو مرتبہ ہند پر چڑھائی کی۔ اُس زمانہ میں فریدون ایران کا بادشاہ تھا جس کے حکم سے پہلے گرشپ بن اطرد سپہ سالار بن کر آیا اور دوسری مرتبہ سام نریمان لشکر لے کر آیا اور غلبہ حاصل کرکے پنجاب وسندھ و کابل کو ایران کی جاگیر بنا کر گیا۔ راجہ کیشوراج کے زمانے میں زمینداران دکن وسنگل دیپ نے متحد ہو کر اس شد و مد سے کیشوراج کے مقابلہ میں بغاوت کی کہ اُسے ایران سے استمداد کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ منوچہر شاہ ایران نے سام نریمان کو فوج کے ساتھ روانہ کیا جس کی مدد سے وہ بغاوت فرو ہوئی۔ واپسی پر کیشوراج سرحد پنجاب تک سام نریمان کے ہمرکاب گیا اور گراں قدر تحفے تحائف

وکیل سے رخصت کیا۔ راجہ فیروز رائے نے اپنے عہد میں ایرانیوں سے بغاوت کی اور پنجاب پر قبضہ کرلیا جب رستم کا دور آیا تو رستم نے ہند پر فوج کشی کی۔ فیروز رائے تاب مقاومت نہ لا سکا تو کوہستان ترہٹ کی جانب بھاگا۔ اُس کا تعاقب کیا گیا۔ چنانچہ اُسی دوڑ دھوپ میں وہ ہلاک ہوگیا۔ رستم نے اُس کی اولاد میں سے کسی کو تخت پر نہ آنے دیا بلکہ سرداران ہند میں سے ایک شخص مُسمّی سورج کو ہندوستان کے تخت پر بٹھادیا۔ سورج نے اپنی بھانجی کی شادی رستم سے کردی اور کیقباد شاہ ایران کی مدت العمر اطاعت و فرمانبرداری کرتا رہا اور سالانہ خراج پابندی کے ساتھ بھیجتا رہا۔ سورج کے زمانہ میں ایرانیوں اور ہندیوں میں میل جول بہت بڑھ گیا تھا اور بہت سی ایرانی رسمیں اس ملک میں داخل ہوگئی تھیں۔ قنوج اسی زمانہ میں آباد ہوا۔ آفتاب پرستی، آتش پرستی، اور بت پرستی کو اس عہد میں بہت فروغ ہوا۔ قنوج کے بت خانے اسی عہد کی یادگار ہیں۔ راجہ شنگل نے تخت پر آکر پھر ایران سے بغاوت کی۔ اُس زمانہ کا شاہ ایران افراسیاب تھا جو سخت برہم ہوا۔ اپنے سپہ سالار کو پچاس ہزار سپاہ کے ہمراہ اُس نے انتقام کے لیے روانہ کیا۔ ہند میں آکر یہ ایرانی لشکر تیسرے ہی دن شکست کھاکر بھاگا اور قریب کے پہاڑوں میں ایک مستحکم مقام پر پناہ گزین ہوا۔ افراسیاب نے سنا تو غضبناک ہوگیا اور ایک لاکھ لشکر جرار لے کر نہایت سرعت کے ساتھ اچانک خود آدھمکا۔ اپنی غضبناکی کے جوش میں اس نے قتل و غارتگری کا وہ مہیب و عبرتناک نقشہ کھینچا کہ اس کی مثالیں تاریخ میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ شنگل بنگالہ کی طرف بھاگ نکلا۔ اس کا تعاقب کیا گیا اور اس تعاقب میں بنگالہ کا ملک غارت ہوگیا۔ جب شنگل کو پناہ کی کوئی جگہ نہ ملی تو گھبرا کر اُس نے افراسیاب کو پیغام بھیجا کہ خطا معاف ہو تو حاضر خدمت ہوکر دولت پابوسی کا شرف حاصل کروں۔ افراسیاب نے درخواست قبول کی۔ تیغ و کفن باندھ کر حاضر ہوا، قدموں پہ گرا، اور خواہشمند ہوا کہ اب مجھے اپنی غلامی میں قبول فرماکر ایران ساتھ چلنے کی اجازت دی جائے۔ افراسیاب کو یہ ادا پسند آئی اور اس نے اس درخواست کو

بھی قبول کر لیا اور گشتاسپ کے بیٹے برہمن کو ہندوستان کے تخت پر بٹھا دیا۔ برہمن جب تک زندہ رہا شاہ ایران کا مطیع و فرمانبردار رہا۔ اپنی آمدنی کے تین حصے کرتا تھا۔ ایک حصہ خیرات کرتا تھا، دوسرا حصہ اپنے باپ اور افراسیاب کی خدمت میں بھیجتا تھا۔ اور تیسرا حصہ اپنی سلطنت پر خرچ کرتا تھا۔ نمونہ کے طور پر عہد قدیم کے یہ چند واقعات ہیں جن سے یورپین تاریخیں بیشتر معرا ہیں اور جو اُس قوم کے مورخین کے قلمبند کیے ہوئے ہیں جو صحیح فن تاریخ نویسی کی موجد ہے۔ روضۃ الصفا میں تواریخ ایران سے منقول ہے کہ :۔

"چون اسفندیار از مہم ارجاسپ فارغ شد در ولایت چین و تتار رفت و در آن سرزمین آتشکدہ ہا ترتیب دادہ خلائق را بر التزام ملت مجوس تکلیف کرد و از آن حدود براہ دریا متوجہ ہندوستان گشت و در آن بلاد نیز کیش آتش پرستی را رواج تمام داد۔"

خود اسفندیار کا مقولہ اس کتاب میں مندرجہ ذیل الفاظ میں مرقوم ہے:۔

"از راہ دریا رخت بہندوستان کشیدم و ہندیان در مقام معارضہ آمدند ہم بمقاتلہ انجامید چندان محاربہ کردم کہ بر اوشان غالب گشتم و سرداران دیار ہند را اسیر کردہ در گردن خرطوم پیلان آویختم و یکہزار و سیصد فرسنگ از بلاد آن دیار در زیر قدم آوردم و در اقصیٰ بلاد ہندوستان معابد بسیار بنا نمودم۔"

اس نوع کے واقعات مسلسل کا حساب لگانے سے تخمینہ ہوتا ہے کہ دو سوا دو ہزار برس قبل مسیح سے ہندوستان اہل ایران کا تختہ مشق بنا رہا اور ایرانی تمدن اور مذہب کا اثر اس ملک میں بزور شمشیر پھیلایا گیا۔

جب ایران کو یونانیوں نے تہ و بالا کر دیا تو اہل یونان کی بھی توجہ ہندوستان کی جانب

منعطف ہوئی۔ چنانچہ سکندر اعظم (Alexander The Great) کا ہندوستان پر مشہور حملہ
تاریخی اہمیت رکھتا ہے جس سے اہل یورپ بھی بے خبر نہ رہ سکے۔ یوروپین مورخین کو اعتراف ہے کہ
ہمیں ہندوستان کے کسی قدر تفصیلی حالات سکندر ہی کے حملہ کی بدولت یونانی تحریروں سے معلوم
ہوئے ہیں۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی تاریخ پر پھر ہمارے لیے تاریکی چھا جاتی ہے یہاں
تک کہ مسلمان ہندوستان پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اپنے لٹریچر کو تاریخی معلومات سے لبریز کر دیتے ہیں۔

سنہ ۳۲۶ قبل مسیح سکندر نے دریائے سندھ عبور کر کے دریائے جہلم کا رخ کیا۔ ایک خونخوار
جنگ کے بعد راجہ پورس (Porus) پر غلبہ پایا۔ دریائے گنگا کی جانب بڑھنے کا قصد تھا کہ
فوج کی بد دلی سے واپسی پر مجبور ہوا چنانچہ پنجاب میں دو سال کے قیام اور معاہدوں کے بعد دریائے
سندھ کی راہ سے واپس ہوا۔ اسی عرصہ میں اس نے یہاں لوگوں سے میل جول پیدا کیا۔ والیان ملک
اور سرداران ذی وقار سے دوستانہ تعلقات قائم کیے کچھ شہر آباد کیے چند قلعے تعمیر کیے ہندیوں اور
یونانیوں میں آپس میں بکثرت بیاہ شادیاں ہونے دیں اور بہت بڑی تعداد میں یونانیوں کو یہاں
چھوڑ گیا جو اس ملک میں رہ پڑے اور یہیں کے ہو گئے۔

چندر گپتا (موریا) ہندوستان کا رہنے والا ایک تیز اور چلتا ہوا شخص تھا۔ وادی گنگا سے
جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ سکندر کی آمد کا شور سن کر اس کے پاس پہنچ گیا اور حسن تدبیر سے اس کی نگاہ میں وقیع
بن کر اس کے کیمپ میں داخل ہو گیا۔ سکندر کی واپسی کے بعد اس ملک میں گڑبڑ مچی اس سے فائدہ اٹھا کر
چندر گپتا سنہ ۳۲۲ قبل مسیح میں ملک بہار کا بادشاہ بن گیا اور رفتہ رفتہ ہندوستان کے بڑے حصہ کا فرمانروا
ہو گیا۔ ادھر سکندر نے سنہ ۳۲۳ قبل مسیح وفات پائی تو اس کی ساری مملکت اس کے سپہ سالاروں میں تقسیم
ہو گئی۔ اور اس کے ایشیائی مقبوضات اس کے سپہ سالار سلیوکس (Seleucus) کے قبضہ میں
آ گئے۔ چندر گپتا نے اس جدید یونانی فرمانروائے مشرق کی دختر سے شادی کر کے تعلقات یگانگت کو بڑھایا

پھر چندر گپتا اور اس کے خاندان نے عرصہ تک ہندوستان پر حکومت کی۔ بودھ مذہب کو قبول کرنے والا اور فروغ دینے والا ہندوستان کا مشہور اور زبردست بادشاہ اشوک جس کے مقبوضات افغانستان، بلوچستان، کشمیر سے لے کر نیپال، بنگال اور دکن تک پھیل گئے تھے اسی چندر گپتا کا پوتا تھا

یونانی اثرات کا غلبہ ہندوستان پر ۳۲۷ قبل مسیح سے لے کر ۲۰۰ قبل مسیح تک رہا۔ اس دور میں مشرق و مغرب کے درمیان راہیں کشادہ ہوگئیں۔ تجارتی تعلقات زیادہ قوی ہوگئے۔ مذہبی روایات، تمدنی و معاشرتی معاملات اور قومی و ملکی رسم و رواج میں تبادلے واقع ہوئے۔ یہ بھی ایک بڑا سبب ہے، جو ہندو دیومالا (Hindu Mythology) اور یونانی دیومالا (Greek Mythology) میں اس درجہ قریبی مشابہت ہے۔ اس قریبی مشابہت پرسے پردہ آگے چل کر اٹھایا جائیگا۔ رگ وید سے جو ویدک اقوام کا تمدن ظاہر ہوتا ہے وہ قدیم یونانی تمدن سے بڑی حد تک ملتا جلتا ہے۔

بعد میں چند اور اجنبی اقوام بھی ہند میں داخل ہوئیں اور کسی قدر کشمکش کے بعد ہندؤں میں جذب ہوگئیں مثلاً شاکا (Scythians) جو یونانی عہد ہی میں ۱۲۰ قبل مسیح سے آنا شروع ہوئے تین سو برس تک ان کا دور دورہ رہا ۴۰۰ء میں ان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ لوگ ہندوؤں میں جذب ہوگئے اور پنجاب کے جاٹ انہیں کی نسل سے بیان کیے جاتے ہیں۔ ان کا زور ٹوٹنے سے قبل ہی سے نواح چین سے وسط ایشیا ہوتی ہوی ایک قوم کشن (Kushans) آدھمکی اور اس نے بھی پورے شمالی ہند پر قبضہ کرلیا۔ خانہ جنگیوں اور بدنظمیوں کا یہ دور گپتا خاندان نے ختم کیا اس خاندان کا بانی چندر گپتا تھا جو اپنے ہمنام سے جس کا ذکر سکندر کے سلسلہ میں پہلے آچکا ہے مختلف ہے اس گپتا خاندان کی حکومت ۳۲۰ء سے لیکر ۴۸۰ء تک رہی۔ یہ ہندوؤں کا عہد زرین قرار دیا جاتا ہے۔ اس عہد میں پانچ زبردست بادشاہ باقتدار، صاحب وجاہت، علوم و فنون کو فروغ دینے والے

اور ملک میں خوش حالی پیدا کرنے والے گذرے۔ مگر اس عہد زرین کا خاتمہ اُس وحشی قوم نے کر دیا جو ہنس (Huns) کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں اس قوم نے ایران و افغانستان و ہندوستان کو تہ و بالا کر دیا۔ قتل و غارتگری و ظلم و سفاکی کا بازار گرم رکھا۔ سنہ ۵۶۵ء میں ترکوں نے وسط ایشیا میں ان لوگوں کا خاتمہ کر دیا اور ہندوستان کو ان کے عذاب سے بچا لیا مگر ہندوستان کی آبادی میں ایک جدید عنصر کا اضافہ بھی کر دیا۔ راجپوتوں کے چند قبائل انہیں کی نسل سے بیان کیے جاتے ہیں ہنس کی سفاکیاں ہندوستان میں سنہ ۶۰۶ء تک قائم رہیں۔ اس کے بعد قنوج کے راجہ ہرشہ وردہان نے سارے شمالی ہند پر تسلط حاصل کر لیا مگر وہ لاولد مرا اور اس کے بعد ہند میں پھر طوائف الملوکی کا زور ہو گیا یہاں تک کہ محمد بن قاسم نے سندھ پر سنہ ۷۱۱ء میں حملہ کر دیا۔

سواحل ملابار پر عرب تاجروں کی آمد و رفت محمد بن قاسم کے سندھ آنے سے بھی قبل شروع ہو گئی تھی اور مسلمانوں کا مذہبی اثر ہند میں ساتویں صدی کے آخر سے محسوس ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کا ثبوت ویدکی اُن تفاسیر اور ہندوؤں کی اُن مذہبی تصانیف میں پایا جاتا ہے جو ساتویں صدی کے بعد وجود میں آئیں۔

اس کے بعد کے زمانے میں یورپین اثرات کا جو غلبہ ہندوؤں کے مذہب و خیالات پر پایا جاتا ہے۔ اس کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

یہ سب خارجی اثرات کی فہرست ہے۔

اسلام اور ضبط ولادت

(۳)

ضبط ولادت کی تائید میں جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں، ان میں سے اکثر و بیشتر اُن حالات پر مبنی ہیں جو مغربی تہذیب و تمدن نے پیدا کیے ہیں۔ حامیانِ ضبط ولادت کا طریق فکر یہ ہے کہ تمدن و معاشرت کے یہ اطوار، اور تہذیب کے یہ طریقے، اور معیشت کے یہ اصول تو ناقابل تغیر ہیں۔ البتہ ان سے جو مشکلات پیدا ہوتی ہیں، ان کو ضرور حل کرنا چاہیے، اور ان کا آسان حل یہی ہے کہ افزائش نسل کو روک دیا جائے لیکن ہم کہتے ہیں کہ تم تمدن و تہذیب کے اسلامی اصول اور معیشت و معاشرت کے اسلامی قوانین اختیار کرکے ان مشکلات ہی کو پیش آنے سے روک دو جنھیں حل کرنے کے لیے تم کو قوانین فطرت کے خلاف جنگ کرنی پڑتی ہے۔

اس مسئلہ پر اشاعت گذشتہ میں کافی بحث کی جاچکی ہے۔ لہٰذا اب ہم صرف ان دلائل سے بحث کریں گے جو مخصوص حالات پر نہیں بلکہ عام انسانی حالات پر نظر کرکے حامیان ضبط و لادت نے اپنی کتابوں اور تقریروں میں بیان کیے ہیں۔

خدائی انتظامات میں مداخلت سب سے بڑی دلیل جس نے لوگوں کو بہت زیادہ دھوکے میں ڈالا ہے یہ ہے کہ زمین میں قابل سکونت جگہ محدود ہے۔ انسان کے لیے وسائل معاش بھی محدود ہیں لیکن انسانی نسلوں میں افزائش کی قابلیت غیر محدود ہے۔ زمین میں ایک اچھے معیار زندگی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار ملین آدمی سما سکتے ہیں۔ اس وقت زمین کی آبادی دو ہزار ملین تک پہنچ چکی ہے، اور اگر حالات مناسب ہوں تو ۳۰ سال کے اندر یہ آبادی دوگنی ہوسکتی ہے۔ لہٰذا یہ اندیشہ بالکل

بجا ہے کہ ۵۰ سال کے اندر زمین آدمیوں سے بھر جائیگی، اور اس کے بعد نسلوں میں جو اضافہ ہوگا وہ اولادِ آدم کے معیارِ زندگی کو گراتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ ان کے لیے بھلے آدمیوں کی طرح زندگی گذارنا مشکل ہو جائے گا۔ پس انسانیت کو اس خطرہ سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ تحدیدِ نسل Birth limitation کے طریقے اختیار کر کے نسلوں کی افزائش کو ایک حدِ مناسب کے اندر محدود کر دیا جائے۔

یہ دراصل خدا کے انتظام پر نکتہ چینی ہے۔ جس بات کو یہ لوگ خود حساب لگا کر اس قدر آسانی کے ساتھ معلوم کر سکتے ہیں، ان کا گمان ہے کہ خدا اس سے بے خبر ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ زمین میں کس قدر گنجائش ہے اور انسان کس حد تک اس میں سما سکتے ہیں۔ يَظُنُّونَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ۔ ان نادانوں کو معلوم نہیں کہ اللہ نے ہر چیز کو ایک اندازے سے پیدا کیا ہے۔ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ۔ اس کے خزانوں سے جو چیز بھی صادر ہوتی ہے ایک جچے تلے اندازے پر ہوتی ہے۔ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۔ ان کا گمان خواہ کچھ ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ جس ہستی نے اس عالم کو پیدا کیا ہے وہ تخلیق و آفرینش کے فن میں اناڑی نہیں ہے۔ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غَافِلِيْنَ۔ اگر یہ اس کے کاموں کو بصیرت کی آنکھوں سے دیکھتے اور اس کے انتظام پر غور کرتے تو ان پر خود ہی روشن ہو جاتا کہ وہ اپنے حساب اور اندازے میں ان سے زیادہ کامل ہے۔ اس نے اسی محدود رقبۂ زمین پر اپنی مخلوق کی بے شمار انواع پیدا کی ہیں جن میں سے ہر ایک کے اندر توالد و تناسل کی ایسی زبردست قوت ہے کہ اگر صرف ایک ہی نوع، بلکہ بعض انواع کے صرف ایک جوڑے کی نسل کو وہ پوری قوت کیساتھ بڑھنے دے تو ایک قلیل مدت میں تمام روئے زمین صرف اسی نسل سے پٹ جائے، اور کسی دوسری نسل کے لیے ذرہ برابر جگہ باقی نہ رہے۔ مثال کے طور پر نباتات کی ایک قسم ہے جس کو نباتیات میں Sisymbrium Sophia

کہتے ہیں۔ اس نوع کے ہر فرد میں عموماً ساڑھے سات لاکھ بیج ہوتے ہیں۔ اگر اس کے صرف ایک پودے کے سب بیج زمین میں اُگ جائیں۔ اور تین سال تک اس کی نسل بڑھتی رہے تو زمین میں دوسری نسلوں کے لیے ایک چپہ بھی باقی نہ رہے۔ ایک قسم کی مچھلی (Star fish) ۲۰ کروڑ انڈے دیتی ہے۔ اگر اس کے صرف ایک فرد کو اپنی پوری نسل بڑھانے کا موقع مل جائے تو تیسری چوتھی پشت تک پہنچتے پہنچتے تمام دنیا کے سمندر اسی سے لبالب بھر جائیں اور ان میں پانی کے ایک قطرے کی بھی گنجائش نہ رہے۔ دور کیوں جائیے۔ خود انسان ہی کی قوت تناسل کو دیکھ لیجئے۔ ایک مرد کے جسم سے ایک دفعہ میں جو مادہ خارج ہوتا ہے۔ اس سے تمام دنیا کی بالغ عورتیں حاملہ ہو سکتی ہیں۔ اگر صرف ایک ہی مرد کی پوری استعداد تناسل کو قوت سے فعل میں آنے کا موقع مل جائے تو چند سال میں ساری زمین اس کی اولاد سے کھچا کھچ بھر جائے۔ مگر وہ کون ہے جو ہزاروں لاکھوں سال سے کرہ زمین پر ان بے شمار انواع کو اس زبردست قوت تناسل کے ساتھ پیدا کر رہا ہے اور کسی نوع کو اس کی مقرر و مقدر حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتا؟ کیا وہ تمہاری سائنٹیفک تدبیریں ہیں، یا خدا کی حکمت؟ خود تمہارے اپنے سائنٹیفک مشاہدات گواہ ہیں کہ مادۂ ذی حیات میں نشوونما کی قوت بے اندازہ ہے حتیٰ کہ ایک واحد الخلیہ جرم نامی (Unicellular Organism) میں نمو کی اتنی قوت ہوتی ہے کہ اگر اس کو پیہم غذا ملتی رہے اور تقسیم در تقسیم کا موقع مل جائے تو پانچ سال کے اندر وہ اتنا ذی حیات مادہ پیدا کر سکتا ہے جو زمین کی حجامت سے دس ہزار گنا زیادہ ہوگا۔ مگر وہ کون ہے جس نے قوت حیات کے اس خزانے پر کنٹرولر مقرر کر رکھے ہیں؟ وہ کون ہے جو اس خزانے میں سے قسم قسم کی مخلوقات نکال رہا ہے، اور ایسے ٹھیک حساب کے ساتھ نکال رہا ہے کہ اس میں نہ کبھی افراط ہوتی ہے نہ تفریط؟ ۔

اگر انسان اپنے خالق کی ان نشانیوں پر غور کرے تو وہ کبھی اس کے انتظام میں دخل

دینے کی جرأت نہ کرے۔ یہ سب جاہلانہ اوہام ہیں جو محض اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ لوگ آفاق اور خود اپنے انفس میں اپنے رب کی آیات کو نہیں دیکھتے۔ ان کو ابھی تک یہ بھی نہیں معلوم ہوا کہ انسانی سعی و عمل کی حد کہاں تک ہے اور کس حد پر پہنچ کر خالص خدائی انتظامات شروع ہوتے ہیں جن میں دخل دینا دور کنار سمجھنے پر بھی انسان قادر نہیں ہے۔ جب انسان اپنی حد جائز سے بڑھ کر خدا کے حدود انتظام میں دخل دینے کی کوشش کرتا ہے، تو خدا کے انتظامات میں تو وہ ذرہ برابر بھی خلل انداز نہیں ہو سکتا، البتہ خود اپنے لیے نامعقول کاوشیں اور ذہنی الجھنیں ضرور پیدا کر لیتا ہے۔ وہ بیٹھ کر حساب لگاتا ہے کہ دس سال کے اندر ہندوستان کی آبادی ساڑھے تین کروڑ بڑھ گئی۔ آئندہ دس سال میں چار کروڑ اور بڑھ جائیگی۔ ۲۰ سال میں ۳ ۴ کروڑ ہو جائے گی۔ ۹۴ سال میں دگنی ہو جائے گی۔ پھر سوچتا ہے کہ اتنے آدمی آخر کہاں سمائیں گے؟ کیا کھائیں گے؟ کیونکر جئیں گے؟ اسی فکر میں وہ الجھتا ہے، مضامین لکھتا ہے، تقریریں کرتا ہے، کمیٹیاں بناتا ہے، کونسل میں عقلاءِ قوم کو اس مسئلے کا حل دریافت کرنے کے لیے توجہ دلاتا ہے۔ مگر وہ بندۂ خدا نہیں سوچتا کہ جس خدا نے ہزارہا سال سے انسانوں کی بستی اس براعظم میں بسا رکھی ہے وہ خود اس مسئلہ کو حل کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا، اور جب وہ انھیں ہلاک کرنا چاہے گا تو ہلاک بھی کر دیگا! آبادیوں کی پیدائش، اور ان کے گھٹاؤ بڑھاؤ اور ان کے لیے زمین میں گنجائش نکالنے کا انتظام اسی سے تعلق رکھتا ہے۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ (۱۱ : ۱)

زمین میں چلنے پھرنے والی کوئی ہستی ایسی نہیں جس کے رزق کا انتظام خدا کے ذمہ نہ ہو۔ اور وہی زمین میں ان کے ٹھکانے اور ان کے سونپے جانے کی جگہ کو جانتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک کتاب روشن میں لکھا ہوا موجود ہے۔

یہ انتظام ہماری عقل و نظر کی رسائی سے بہت دور کسی پوشیدہ مقام سے ہو رہا ہے۔ اِنَّهٗ

صدی کے خاتمہ سے انیسویں صدی کے وسط تک انگلستان کی آبادی میں جس تیز رفتاری کے ساتھ اضافہ ہوا اس کو دیکھ کر عقلائے فرنگ ابتدا میں حیران تھے کہ یہ بڑھتی ہوئی آبادی کہاں سمائے گی اور کیا کھائے گی۔ مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ انگلستان کی آبادی جس رفتار سے بڑھی، اس سے بدرجہا تیز رفتاری سے اس کے وسائل رزق بڑھے اور انگریزی قوم کو پھیلنے کے لیے زمین کے بڑے بڑے رقبے ملتے چلے گئے۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی ہمارا مشاہدہ ہے کہ اضافہ آبادی کے ساتھ ساتھ وسائل رزق میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۳۱ء کے درمیان اضافہ آبادی کا اوسط ۱ فی صدی رہا لیکن زرعی پیداوار میں ۵ فی صدی اور صنعتی پیداوار میں ۱۵ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ گذشتہ ۳۰ سال کے اندر اس ملک کی آبادی تو صرف ۳ ۱/۲ فی صدی زیادہ ہوئی مگر اس کی زرعی پیداوار میں ۲۹ فی صدی کا اضافہ ہو گیا۔ ظاہر میں ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں موجودہ آبادی سے دوگنی زیادہ آبادی کے لیے وسائل رزق موجود ہیں۔ یہاں کی زمین کا ۶۵ فیصدی حصہ قابل زراعت ہے جس میں سے ابھی تک صرف ۳۵ فی صدی حصہ زیر کاشت آیا ہے۔ اس کے علاوہ قدرتی ثروت کے بہت سے خزانے یہاں موجود ہیں جن سے ابھی کام لینا باقی ہے صنعت اور تجارت کے میدان میں ابھی تک ہندوستان نے اتنا کام بھی نہیں کیا ہے جتنا دوسرے ممالک کر چکے ہیں۔ اور ترقی کے جو امکانات ابھی پوشیدہ ہیں ان کا تو ہم کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ ان سب باتوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے باوجود اگر کوئی شخص اس فکر میں غلطاں ہو کہ یہ روز افزوں آبادی کہاں رہے گی اور کیا کھائے گی، تو یہ اس کی اپنی حماقت ہے۔ اس کا کام صرف انسانی دائرۂ عمل میں رہ کر سوچنا اور عمل کرنا ہے۔ اس دائرہ سے نکل کر وہ خالص خدائی انتظامات کے دائرہ میں قدم رکھنے کی کوشش کرے گا تو اپنے لیے ایسی مشکلات پیدا کر لیگا جن کا درحقیقت کوئی حل اس کے پاس نہیں۔

موت کا بدل حامیان ضبط ولادت تسلیم کرتے ہیں کہ انواع کی تعداد کو ایک حد مناسب کے اندر محدود رکھنے کا انتظام خود فطرت نے کیا ہے، اور یہ انتظام نوع انسانی پر بھی حاوی ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ فطرت اس کام کو موت کے ذریعہ سے انجام دیتی ہے، جس میں انسان کے لیے سخت روحانی اور جسمانی اذیتیں ہیں۔ کیوں نہ ہم اس کے بجائے خود اپنی احتیاطی تدبیروں سے اپنی آبادیوں کو محدود رکھنے کا انتظام کرلیں؟ زندہ انسانوں کے لقمۂ اجل ہوتے، طرح طرح کی تکلیفوں سے جان دینے اور پسماندوں کے تڑپ تڑپ کر رہ جانے سے تو بدرجہا بہتر یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ انسان پیدا ہی نہ ہوں۔

یہاں پھر یہ لوگ خدائی انتظام میں مداخلت بیجا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ تمہاری احتیاطی تدبیروں سے کیا جنگ، وبائیں، امراض، سیلاب، زلزلے بند ہو جائیں گے؟ کیا تم نے خدا (یا بزعم خود "فطرت") سے کوئی ایسا معاہدہ کرلیا ہے کہ جب تم ضبط ولادت پر عمل شروع کروگے تو فرشتہ موت برطرف کر دیا جائے گا؟ اگر ایسا نہیں ہے، اور یقیناً نہیں ہے، تو بتاؤ کہ ضبط ولادت اور فرشتۂ موت کی دوہری کارگذاری کا تختۂ مشق بن کر نوع انسانی کا کیا حشر ہوگا؟ ایک طرف تم خود اپنے ہاتھوں سے اپنی آبادیوں کو گھٹا لوگے۔ دوسری طرف زلزلے ہزاروں آدمیوں کو بیک وقت نذر اجل کر دیں گے، سیلابوں میں بستیوں کی بستیاں اجڑ جائیں گی، وبائیں آکر آبادیوں پر جھاڑو پھیر دیں گی۔ لڑائیوں میں تمہارے سائنٹیفک آلات لاکھوں بلکہ کروڑوں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ اور موت کا فرشتہ فرداً فرداً بھی آدمیوں کی روحیں قبض کرتا رہے گا۔ کیا تم حساب لگا کر اتنا بھی نہیں معلوم کرسکتے کہ جس خزانے میں آمد گھٹتی چلی جائے اور خرچ بدستور رہے وہ کب تک بھرپور رہے گا؟

اس سوال کو بھی جانے دو۔ کیا تمہارے پاس اپنی آبادیوں کے لیے "حد مناسب" مقرر

کرنے کا کوئی معیار رہے؟ اور اگر بالفرض ہے، تو کیا تم اس معیار کے مطابق حسب ضرورت بچے پیدا کرنے اور صرف ضرورت سے زیادہ بچوں کی پیدائش روک دینے پر قادر ہو؟ جب عوام الناس میں خود غرضانہ ذہنیت پیدا ہو جائے، اور وہ اپنے شخصی حالات اور نفسانی رجحانات کی بنا پر بچوں کی ضرورت و عدم ضرورت کا فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں، اور ضبط ولادت کے عملی طریقے اور وسائل بھی آسانی کے ساتھ ان کو بہم پہنچ جائیں، تو کیا یہ ممکن ہے کہ ملکوں اور قوموں کی آبادی کو کسی مناسب حد تک ہی گھٹایا جائے۔ اور اس حد سے زیادہ نہ گھٹنے دیا جائے؟ قیاس کی ضرورت نہیں۔ تجربہ شہادت دے رہا ہے کہ دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک بھی ایسی کوئی "حد مناسب" مقرر کرنے اور افراد کے عمل کو اس حد کے اندر محدود رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ پھر وہ کیا سامان ہے جس کو لے کر تم اُس خدائی تدبیر میں دخل دینے چلے ہو جس کے تحت وہ انسانی بستیوں کے لیے "حد مناسب" مقرر کرتا اور ایک اندازے کے ساتھ ان کو گھٹاتا بڑھاتا ہے؟

معاشی حیلہ | کہا جاتا ہے کہ محدود آمدنی رکھنے والے ماں باپ بچوں کی زیادہ تعداد کے لیے اچھی تعلیم و تربیت، عمدہ معاشرت، اور ایک بہتر آغاز (Fair start) کے وسائل بہم پہنچانے پر قادر نہیں ہو سکتے۔ جب بچوں کی تعداد والدین کی حد استطاعت سے بڑھ جاتی ہے یا مفلس والدین کے ہاں اولاد پیدا ہو جاتی ہے تو ان کا معیار حیات گر جاتا ہے۔ تعلیم خراب، تربیت ناقص، غذا، مکان، لباس، ہر چیز بد تر، اور آئندہ ترقی کے راستے مسدود۔ ایسے حالات میں بیکار آبادی بڑھانے سے بہتر ہے کہ ضبط ولادت کے ذریعہ سے بچوں کی تعداد کو اسی حد تک محدود رکھا جائے جس حد تک والدین کے وسائل ساتھ دے سکیں، اور ناموافق حالات میں افزائش نسل کا سلسلہ موقوف رہے۔ اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی۔

یہ دلیل آج کل لوگوں کو بہت اپیل کر رہی ہے، اور بظاہر بڑی خوشنما معلوم ہوتی ہے

لیکن درحقیقت یہ بھی اتنی ہی کمزور ہے جتنی پہلی دونوں ہیں۔ اول تو "اچھی تعلیم و تربیت"، "عمدہ معاشرت" اور "بہتر آغاز" ہی مبہم الفاظ ہیں جن کا کوئی واضح اور متعین مفہوم نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے ذہن میں ان کا الگ مفہوم رکھتا ہے، اور ان کے لیے ایسے ایسے معیار مقرر کرتا ہے جو اس کے اپنے حالات اور وسائل و ذرائع کی صحیح تشخیص پر نہیں بلکہ اپنے سے بہتر لوگوں کے معیار پر پہنچنے کی حریصانہ خواہش پر مبنی ہوا کرتے ہیں۔ ایسے غلط معیار پر جو شخص اپنی اولاد کے لیے "اچھی تعلیم و تربیت" اور "عمدہ معاشرت" اور "بہتر آغاز" کا خواہش مند ہو گا، وہ یقیناً یہی فیصلہ کرے گا کہ اس کے ہاں ایک دو بچوں سے زیادہ نہ ہوں، بلکہ بعض حالات میں تو وہ سرے سے بے اولاد ہی رہنا پسند کرے گا، کیونکہ لوگوں کی خواہشات کا دائرہ عموماً ان کے وسائل کے دائرہ سے زیادہ وسیع ہوتا ہے، اور جن امور کو وہ خواہشات کے حصول پر موقوف رکھتے ہیں وہ سرے سے ظہور ہی میں نہیں آتے۔ یہ محض نظریہ ہی نظریہ نہیں ہے، بلکہ ایک واقعی حقیقت ہے۔ یورپ میں اس وقت لاکھوں جوڑے ایسے موجود ہیں، جو محض اس لیے بے اولاد رہنا پسند کرتے ہیں کہ ان کے پیش نظر اولاد کی تعلیم و تربیت اور عمدہ معاشرت، اور بہتر آغاز کا معیار اتنا بلند ہے کہ وہ بالفعل اس تک پہنچنے کی قدرت ہی نہیں رکھتے۔

علاوہ بریں یہ دلیل اصولی حیثیت سے بھی غلط ہے۔ قوموں کی ترقی کے لیے یہ بات مفید نہیں بلکہ سخت مضرت رساں ہے کہ ان کی نسلیں تمام تر راحت اور آسائش کے ماحول میں پرورش پائیں اور ان کو مصائب، مشکلات، ناداری، اور جد و جہد سے دوچار ہی نہ ہونا پڑے۔ یہ چیز تو اس سب سے بڑی درسگاہ کو بند کر دے گی جس میں انسان کی تعلیم و تربیت تمہارے مدرسوں اور کالجوں سے زیادہ بہتر طریقہ پر ہوتی ہے وہ درس گاہ زمانے کی درس گاہ ہے۔ جس کو خود اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے تاکہ انسان کے صبر، استقامت، ہمت اور حوصلوں کی آزمائش کرے، اور انہیں کو پاس کرے۔ جو اس آزمائش میں پورے اتریں۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ (۲: ۱۹)

وہ ایک بھٹی ہے جو ناقص کو خالص سے متمیز کرتی ہے اور تپا تپا کر کھوٹ کو نکال دیتی ہے وہاں مصائب اسلیے ڈالے جاتے ہیں کہ ان کے مقابلے کی قوت پیدا ہو مشکلات اسلیے پیدا کی جاتی ہیں کہ انسان ان پر غالب آنے کی جد و جہد کرے۔ سختیاں اس لیے عائد کی جاتی ہیں کہ اس کی کمزوریاں دور ہوں اور اس کی چھپی ہوی قوتیں عمل کے میدان میں نمایاں ہوں۔ جو لوگ اس درس گاہ سے فارغ التحصیل ہوکر نکلتے ہیں وہی دنیا میں کچھ کرکے دکھاتے ہیں اور دنیا میں آج تک جتنے بڑے بڑے کام کیے ہیں وہ اسی درسگاہ کے سند یافتوں نے کیے ہیں۔ تم اس درسگاہ کو بند کرکے دنیا کو راحت کدے میں تبدیل کرنا چاہتے ہو تاکہ تمہاری نسلیں عیش پسند، پست حوصلہ، کام چور، اور ریزہول بن کر اٹھیں تم چاہتے ہو کہ تمہاری اولاد آسائش کے گہوارے میں آنکھ کھولے۔ اونچے مدرسوں اور شاندار اقامت خانوں میں رہ کر تعلیم حاصل کرے اور جوان ہوکر زندگی کے میدان میں قدم رکھے تو اس طرح کہ اس کے پاس ایک "بہتر آغاز" کے لیے کافی سرمایہ موجود ہو۔ تم امید رکھتے ہو کہ اس صورت سے وہ دنیا میں کامیاب ہوں گے اور ترقی کے آسمانوں میں چمکینگے۔ مگر تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایسی تعلیم و تربیت کے ساتھ تم صرف تیسرے درجہ کے ناطق حیوانات پیدا کرسکتے ہو یا زیادہ سے زیادہ دوسرے درجہ کے۔ درجہ اول کے انسان تمہاری نسلوں میں کبھی نہ اٹھیں گے۔ یقین نہ آئے تو دنیا کی تاریخ اور اکابر رجال کے سوانح اٹھا کر دیکھ لو۔ تم کو درجہ اول کے جتنے آدمی ملیں گے ان میں سے کم از کم ۹۰ فی صدی ایسے ہوں گے جو مفلس و نادار ماں باپ کے ہاں پیدا ہوے مصیبت کی آغوش میں پرورش پاکر اٹھے تمناؤں کے خون اور خواہشات کی قربانی کے ساتھ جوانی بسر کی۔ زندگی کے سمندر میں بغیر کسی ساز و سامان کے پھینک دیے گئے۔ موجوں سے تیرنا سیکھا، تھپیڑوں سے بڑھنے کا سبق حاصل کیا۔ اور آخرکار ساحل کامرانی پر اپنی برتری کا جھنڈا نصب کرہی کے چھوڑا۔

چند اور دلیلیں | یہ تین بڑی دلیلیں تھیں۔ ان کے بعد تین چھوٹی دلیلیں اور بھی ہیں جن کو ہم اختصار کے ساتھ بیان کرکے اختصار ہی کے ساتھ جواب بھی دیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ ضبط ولادت کے ذریعہ سے اچھی قسم کی نسلیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ جن کی تندرستی اچھی ہو، قویٰ مضبوط ہوں، اور جن میں کام کرنے کی عمدہ صلاحیتیں ہوں۔ اس خیال کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ انسان کے ہاں جب کبھی ایک دو بچے ہوں گے، قوی و تندرست، ذہین اور طباع ہوں گے اور جب زیادہ بچے ہوں گے تو سب کے سب کمزور، بیمار، بے کار اور کند ذہن ہوں گے۔ لیکن اس مفروضہ کی تائید میں نہ کوئی علمی دلیل ہے، اور نہ باضابطہ مشاہدات و تجربات کے نتائج۔ محض ایک گمان ہی گمان ہے جس کے خلاف ہزاروں شہادتیں عالم واقعہ میں موجود ہیں۔ درحقیقت انسان کی پیدائش کے متعلق کوئی ضابطہ بنایا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ چیز کلیۃً خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اور خدا جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ (۳: ۱) قوی اور تندرست اور ذہین اولاد پیدا کرنا، اور کمزور، مریض اور بلید الذہن اولاد نہ ہونے دینا انسان کے اختیار سے باہر ہے۔

اسی سے قریب المأخذ یہ دلیل ہے کہ ضبط ولادت انسان کو ایسے بچوں کی بے کار پیدائش اور پرورش کی مشقت سے بچا دیتا ہے جن کی دنیا کو ضرورت نہیں ہے۔ جو کبھی کارآمد بننے والے نہیں ہیں، یا بلوغ سے پہلے مر جانے والے ہیں۔ یہ خیال اس وقت صحیح ہوتا جب انسان کے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ ہوتا کہ کونسا بچہ کن خصوصیات کا حامل ہوگا؟ لائق ہوگا یا نالائق؟ زندہ رہیگا یا مر جائے گا؟ اس کا وجود کارآمد ہوگا یا بیکار؟ جب یہ چیز انسانی نظر سے قطعاً پوشیدہ ہے تو محض رجماً بالغیب کوئی رائے قائم کرنا صریح حماقت ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زیادہ بچوں کی پیدائش سے عورت کی صحت خراب ہو جاتی ہے اور اس کے حسن و جمال میں بھی فرق آ جاتا ہے۔ لیکن اشاعت گذشتہ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ ضبط ولادت کے مصنوعی طریقے بھی صحت اور جمال کے لیے بے ضرر نہیں ہیں۔ ان سے بھی صحت کو اتنا ہی نقصان پہنچتا ہے جتنا کثرت اولاد سے پیدا ہو سکتا ہے۔ طبی حیثیت سے کوئی ایسا قاعدۂ عام مقرر نہیں کیا جا سکتا

کہ عورت کتنے بچوں کی ولادت کا بار اٹھا سکتی ہے۔ یہ بات ہر عورت کے شخصی حالات پر منحصر ہے اگر ایک طبیب کسی عورت کے خاص حالات کو پیش نظر رکھ کر یہ رائے قائم کرے کہ حمل اور وضع حمل کی تکلیف اس کی زندگی کے لیے خطرناک ہوگی تو ایسی حالت میں بلاشبہ طبیب کے مشورے سے ضبط ولادت کا کوئی مناسب طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے، بلکہ اگر ماں کی جان بچانے کے لیے ضروری ہو تو اسقاط حمل کرانا بھی ناجائز نہیں ہے لیکن صحت کو محض ایک بہانہ بنا کر ضبط ولادت کو ایک عام طرز عمل بنا لینا اور دائماً اس پر عمل کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔

اصول اسلام سے کلی منافات حامیان ضبط ولادت کے مذکورہ بالا دلائل پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تحریک دراصل دہریت و الحاد کے شجر خبیث کی پیداوار ہے جن لوگوں کے دماغوں سے خدا کا تصور نکل چکا ہے، اور جو دنیا کے معاملات میں اس نقطۂ نظر سے غور و فکر اور تدبیر و تصرف کرتے ہیں کہ خدا سرے سے موجود نہیں ہے۔ یا اگر ہے تو محض ایک معطل ہستی ہے، اور انسان آپ ہی اپنی قسمت کا بنانے والا اور اپنے تمام معاملات کی تدبیر کرنے والا ہے، وہی اس تحریک کو وجود میں لائے ہیں، اور انہی کے دماغوں کو اس تحریک کے دلائل اپیل کرتے ہیں۔ اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد یہ امر کسی تشریح کا محتاج نہیں رہتا کہ یہ تحریک اصلاً اسلام کے خلاف ہے! اس کے اصول کلیتہً اصول اسلام کی ضد ہیں، اور اسلام کا عین مقصد ہی اُس ذہنیت کو مٹانا ہے جس سے ضبط ولادت جیسی تحریکات وجود میں آتی ہیں

احادیث نبوی مسلمانوں میں جو حضرات ضبط ولادت کے مؤید ہیں ان کو اپنی تائید میں قرآن سے ایک لفظ بھی نہیں مل سکتا اس لیے وہ حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں اور بعض ایسی احادیث سے استدلال کرتے ہیں جن میں اس فعل کی اجازت پائی جاتی ہے لیکن حدیث سے استدلال کرنے میں چند امور کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے جن کو نظر انداز کر کے کسی فقہی مسئلہ کا استنباط نہیں کیا جا سکتا۔

اولاً، مسئلہ متعلقہ کے باب میں تمام احادیث کا استقصار کیا جائے۔

ثانیاً۔ ارشاد نبوی کے موقع و محل کو پیش نظر رکھا جائے۔

ثالثاً، اس وقت عرب کے جو حالات تھے ان کو ملحوظ رکھا جائے۔

لہذا ہم ان تینوں امور کو ملحوظ رکھ کر ان احادیث پر نظر ڈالیں گے جو اس باب میں وارد ہوئی ہیں۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ عرب جاہلیت میں برتھ کنٹرول کے لیے قتل اولاد کا طریقہ رائج تھا جس کے دو وجوہ تھے۔ ایک معاشی حالات کی خرابی جن کی وجہ سے ماں باپ اپنی اولاد کو مار ڈالتے تھے تاکہ ان کے رزق میں کوئی شریک نہ پیدا ہو۔ دوسرے غیرت کا حد سے بڑھا ہوا جذبہ، جو لڑکیوں کے قتل کا محرک ہوتا تھا۔ اسلام نے آکر اس کو سختی کے ساتھ منع کیا، اور اس باب میں عربوں کی ذہنیت ہی بدل دی۔ اس کے بعد مسلمانوں کا رجحان عزل Coitus Interruptus (یعنی مباشرت بلا انزال فی الفرج) کی طرف راغب ہوا۔ لیکن یہ رجحان عام نہ تھا۔ نہ برتھ کنٹرول کی کوئی تحریک جاری ہوئی تھی۔ نہ اس کو قومی پالیسی بنانا مقصود تھا۔ نہ اس کے محرک وہ عہد جاہلیت کے جذبات اور خیالات تھے جن کی وجہ سے قتل اولاد کے ظالمانہ طریقہ پر عمل کیا جاتا تھا۔ بلکہ در اصل اس کے تین وجوہ تھے جو احادیث کے تتبع سے ہم کو معلوم ہوتے ہیں۔

ایک یہ خیال کہ لونڈی سے اولاد نہ ہو۔

دوسرے یہ کہ لونڈی کے امّ ولد ہو جانے سے یہ خوف تھا کہ وہ فروخت نہ کی جا سکے گی۔

تیسرے یہ کہ زمانہ رضاعت میں حمل ٹھیر جانے سے شیر خوار بچہ کو نقصان پہنچنے کا خوف تھا۔

ان وجوہ سے مخصوص حالات میں بعض صحابہ نے عزل کی ضرورت محسوس کی اور یہ دیکھ کر کہ اس فعل کے عدم جواز کا کوئی صریح حکم کتاب و سنت میں نہیں آیا ہے، اس پر عمل کیا، مثلاً ابن عباس، سعد بن ابی وقاص اور ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہم۔ انہی میں سے ایک حضرت جابر بھی ہیں۔ جنہوں نے شارع کے سکوت کو رضا پر محمول کیا ہے۔ چنانچہ ان سے جو احادیث مروی ہیں ان کے

الفاظ یہ ہیں۔

کنا نعزل علی عھد رسول اللہ صلعم	ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عزل کرتے تھے
کنا نعزل والقرآن ینزل۔	ہم عزل کرتے تھے اس حال میں کہ قرآن نازل ہو رہا تھا۔
کنا نعزل علی عھد رسول اللہ صلعم والقرآن ینزل۔	ہم عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں عزل کرتے تھے جبکہ قرآن نازل ہو رہا تھا۔

ان احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت جابر اور ان کے ہم خیال صحابہ نے عزل کے باب میں کوئی صریح حکم نہ ہونے سے فائدہ اٹھایا۔ ایک اور حدیث جو انہی صحابی سے امام مسلم نے نقل کی ہے، یہ ہے کہ ہم عہد رسالت میں عزل کرتے تھے۔ اس کی خبر حضور کو پہنچی اور آپ نے ہم کو منع فرمایا" اس حدیث میں ابہام ہے۔ صاف معلوم نہیں ہوتا کہ عزل کے متعلق کس صورت سے استفتا کیا گیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کیا فرمایا۔ اس کی تفصیل دوسری احادیث میں بیان ہوئی ہے

ابوسعید خدری سے مروی ہے کہ ہمارے ہاتھ لونڈیاں آئیں اور ہم نے عزل کیا۔ پھر اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ نے فرمایا: کیا تم ایسا کرتے ہو؟ کیا تم ایسا کرتے ہو؟ کیا تم ایسا کرتے ہو؟ قیامت تک جو بچے پیدا ہونے ہیں وہ تو ہو کر ہی رہیں گے"۔ (بخاری)۔

امام مالک نے موطا میں انہی ابوسعید سے یہ روایت نقل کی ہے کہ غزوۂ بنی المصطلق میں ہمارے ہاتھ لونڈیاں آئیں۔ اہل وعیال سے دوری ہم پر شاق گزر رہی تھی۔ ہم نے چاہا کہ ان عورتوں سے استمتاع کریں۔ مگر اس کے ساتھ ہماری خواہش یہ بھی تھی کہ ان کو فروخت کردیں۔ اس لیے ہم نے خیال کیا کہ ان سے عزل کرنا چاہیے تاکہ اولاد پیدا نہ ہو۔ ہم نے حضور سے سوال کیا۔ آپ نے فرمایا۔ مَا عَلیکم ان لا تفعلوا۔ مَا من نسمۃ کائنۃ الا وھی کائنۃ۔ اگر تم ایسا نہ کرو تو کوئی حرج نہیں۔ قیامت تک جو بچے پیدا ہونے والے ہیں وہ تو ہو کر ہی رہیں گے"۔

مسلم کی حدیث ہے کہ جب عزل کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔ لا علیکم ان لا تفعلوا ذٰلکم۔ "اگر تم ایسا نہ کرو تو کوئی حرج نہیں"۔ ایک دوسری حدیث میں ہے۔ ولم یفعل ذٰلک احدکم "تم میں سے کوئی یہ فعل کیوں کرے؟" ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ میرے پاس ایک لونڈی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اس سے اولاد ہو۔ اس پر حضور نے فرمایا اعزل عنها ان شئت فانه سیأتیها ما قدر لها۔ "تو چاہے تو عزل کرلے۔ مگر جو اولاد اس کی تقدیر میں لکھی ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گی۔"

ان کے علاوہ حضرت ابوسعید سے ترمذی نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ صحابہ میں سے جو اہل علم تھے وہ عموماً عزل کو مکروہ سمجھتے تھے۔ موطا میں امام مالک نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عمر بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو عزل کو ناپسند کرتے تھے۔

ان سب روایات کو پیش نظر رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل کی اجازت نہ دی تھی۔ بلکہ آپ اس کو ایک عبث اور ناپسندیدہ فعل سمجھتے تھے، اور آپ کے جن اصحاب کو تفقہ فی الدین کا مرتبہ حاصل تھا وہ بھی اس کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے لیکن چونکہ عزل کی کوئی عام تحریک قوم میں جاری نہیں ہوئی تھی، اور اس کو ایک عام قومی طرز عمل نہیں بنایا جارہا تھا، اور محض چند افراد اپنی مجبوریوں اور ضرورتوں کی بنا پر اس فعل کا ارتکاب کرتے تھے، اس لیے آپ نے اس کو صاف طور پر ناجائز نہ ٹھیرایا۔ اگر اس وقت برتھ کنٹرول کی کوئی عام تحریک شروع ہوتی تو یقیناً حضور نہایت سختی کے ساتھ اس کو روکتے۔

عزل پر ضبط ولادت کے دوسرے طریقوں کو بھی قیاس کر کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان طریقوں کو شارع نے صرف اس وجہ سے حرام نہیں کیا کہ بعض حالات میں انسان فی الواقع ان کو اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اور احتیاط کا مقتضی یہی ہے کہ اس کو ایسا کرنے کی اجازت دیدی جائے۔ مثلاً

عمل ٹھیرنے سے عورت کی جان کا خطرے میں پڑ جانا، یا اس کی صحت کو غیر معمولی نقصان پہنچنے کا خوف، یا زمانۂ رضاعت میں شیر خوار بچے کو مضرت پہنچنے کا اندیشہ، یا اور ایسے ہی دوسرے وجوہ ان حالات میں اگر آدمی طبی مشورے سے ضبط ولادت کا کوئی طریقہ اختیار کرے تو یہ جائز ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ لیکن بلا ضرورت اس کو ایک عام طرزِ عمل بنانا احکامِ اسلام کے قطعاً خلاف ہے، اور وہ تمام خیالات جن کی بنا پر ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے کی طرف رجحان پیدا ہوتا ہے، اصولِ اسلام کے بالکل منافی ہیں۔

تنزیل و تاویل

بحث برزخ

از جناب مولنا اسلم جیراجپوری

میرے مضمون برزخ کے متعلق آپ نے جو کچھ ترجمان القرآن ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۳ھ میں لکھا ہے وہ انھیں صداؤں کی بازگشت ہے جو معارف میں میرے جامعہ والے مضمون کے جواب میں اٹھائی گئی تھیں۔ آپ نے جتنی باتیں لکھی ہیں ان سب کی غلطی واضح کرنے میں طوالت ہوگی اس لیے میں نے ان میں سے چند اصولی باتیں چن لی ہیں جن کا قرآن کی تعلیمات کے خلاف ہونا ثابت کر دیتا ہوں ان سے آپ کے سارے مضمون کا جواب ہو جائے گا۔ اور اسی ضمن میں ان لوگوں کی غلطیاں بھی ظاہر ہو جائیں گی جنہوں نے معارف میں جوابات لکھے تھے اور اہل نظر کے سامنے سے وہ غبار جو تقلیدی خیالات کا اڑایا گیا ہے، دور ہو جائے گا۔ اور قرآن کریم کی واضح تعلیمات میں کوئی حجاب حائل نہ رہے گا۔[1] انشاء اللہ تعالیٰ۔

۱- برزخ کا مفہوم بیان کرتے ہوئے آپ ص ۲۳۴ میں لکھتے ہیں کہ۔

اگر یہ (برزخ) آڑ ہے تو میت اور دنیا کے درمیان آڑ ہے یا میت اور قیامت کے درمیان ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان ہرگز نہیں قرآن مجید میں کوئی اشارہ ایسا نہیں ملتا جس سے یہ مفہوم نکلتا ہو کہ برزخ میں مردے

[1] ہم نے مولنا کی تمام قابل جواب باتوں پر نمبر لگا دیے ہیں اور آخر میں ہر نمبر کا جواب لکھدیا ہے۔ ناظرین ہر نشان زدہ فقرے کا جواب بھی ساتھ ساتھ پڑھتے جائیں۔

اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں رکھے جاتے ہیں۔ یہ محض ایک بے بنیاد قیاس ہے۔"

اس عبارت میں آپ کا پہلا فقرہ یعنی "آڑ ہے تو میت اور دنیا کے درمیان آڑ ہے" بالکل قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن نے تو تصریح کر دی ہے کہ "مِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (ان کے آگے برزخ ہے اٹھائے جانے کے دن تک) اس میں برزخ کے دونوں حدود متعین کر دیے گئے ہیں۔ کہ وہ مرنے والے کی موت سے لیکر حشر تک ہے نہ کہ میت اور دنیا کے درمیان (۱)۔ بے شک دوسرا فقرہ آپ کا صحیح ہے کہ وہ میت اور قیامت کے درمیان آڑ ہے۔ اسی قیامت کو میں نے رب کی حضوری سے تعبیر کیا ہے۔ اور قرآن سے اس کی دلیل بھی لکھدی ہے کہ۔

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ (۳۶-۵۳) بس ایک شور ہوگا اور وہ سب کے سب ہمارے پاس حاضر کر دیے جائیں گے۔

اس آیت بالا میں قیامت ہی کا مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ قیامت کسی دوسرے کے پاس حاضری کا نام ہے؟ قرآن میں اس کی اسقدر تصریحیں ہیں جن کا شمار کرنا مشکل ہے مثلاً۔ ثُمَّ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ۔ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ۔ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وغیرہ۔ اس لیے یہ بے بنیاد قیاس نہیں ہے۔ جیسا کہ آپ کا گمان ہے بلکہ قرآن کی تعلیم کی ہوئی نفس الامری حقیقت ہے (۲)۔ شہدا جان دینے کے ساتھ ہی وہ عِنْدَ رَبِّهِمْ "پہنچ جاتے ہیں۔ (۳)۔ اور دوسرے لوگ آڑ میں رکھے جاتے ہیں۔ وہ قیامت کے دن رب کی حضوری میں لائے جائینگے۔

۲۔ صا۴۱۳ میں قبل از حیات دنیا انسانوں کے زندہ ہونے کا ثبوت دینے کے لئے آپنے عہد الست والی آیت نقل کی ہے جس کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب روحیں جسموں میں پھونکی نہ گئی تھیں اور جب کہ

موت ان پر طاری تھی اس وقت بھی وہ اس معنی میں مردہ نہ تھیں کہ ان میں سماعت اور گویائی اور علم وشعور نہ تھا حق تعالیٰ نے ان سے جو سوال کیا اسکو انھوں نے سنا۔ اس کا جواب دیا اور جواب علم کی بنیاد پر دیا۔"

آپ کا یہ عجیب وغریب دعویٰ کون تسلیم کرسکتا ہے کہ ان میں روحیں بھی پھونکی نہ گئی تھیں پھر بھی ان میں سماعت تھی، گویائی تھی علم تھا اور شعور تھا۔ (۴) اس آیت میں تو انسان کی سرشت اور فطرت کا بیان ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔ (۵)۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ

یہی اللہ کی فطرت ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اس کی بناوٹ میں کوئی تبدیلی نہیں ہے یہی سیدھا دین ہے

اگر سماعت گویائی اور علم وشعور کی دلیل یہی ہے تو مندرجہ ذیل آیت سے۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ (۳۳/۷۲)

ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا۔ ان سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اور ڈر گئے۔ اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔

ان چیزوں میں بھی جو جامدات ہیں آپ کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ "سماعت تھی، گویائی تھی اور علم وشعور تھا۔ حق تعالیٰ نے ان سے جو سوال کیا اس کو انھوں نے سنا۔ اس کا جواب دیا اور جواب علم کی بنیاد پر دیا"۔ (۶)

۳۔ موت کے بعد مردوں میں زندگی کا ثبوت آپ نے مندرجہ ذیل آیت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

حَتّٰى إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا

یہاں تک کہ ان میں سے جب کسی کی موت آتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے میرے رب مجھے لوٹا دے امید ہے کہ

فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۔ إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا وَ مِنْ وَّرَائِهِمْ بَرْزَخٌ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ (۲۳ : ۱۰۰)	میں نے جو کچھ چھوڑا ہے اس میں عمل صالح کرونگا ہرگز نہیں یہ تو ایک بات ہے جس کو وہ کہتا ہے اور ان

مرنے والوں کے آگے اٹھائے جانے کے دن تک آڑ ہے۔

آپ لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ ذکر اس حالت کا ہے جب دنیا چھوٹ چکی ہے، برزخ اس کے اور دنیا کے درمیان حائل ہو چکی ہے"۔

یہ صحیح نہیں جیسا کہ میں پہلے ثابت کر چکا ہوں، برزخ دنیا اور مردے کے درمیان حائل نہیں ہوتی بلکہ مردے اور قیامت کے درمیان حائل ہوتی ہے۔ جب آپ کی یہ بنیاد ہی غلط ہو گئی تو آگے جو ردّے آپ نے چڑھائے ہیں ان کے متعلق بحث کی ضرورت ہی نہیں رہی (۷)۔

دراصل یہ قول مُردوں کے مرنے کے وقت کا ہے نہ کہ مرنے کے بعد کا۔ (۸)۔ اسی مضمون کی وہ آیت ہے جو اس کے بعد آپ نے نقل کی ہے۔

وَأَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ ۔ (۶۳ : ۱۰) ۔	اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرو اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت آجائے۔ پھر وہ کہیگا کہ اے رب! کیوں نہ تو نے تھوڑے عرصہ تک مجھے مہلت دی کہ میں صدقہ دیتا اور نیک بندوں میں سے ہو جاتا۔

اس کے بعد کی بھی آیات جو آپ نے نقل کی ہیں صریحاً موت ہی کی حالت کی ہیں نہ کہ موت کے بعد کی (۹)۔

۴۔ ثواب برزخ کے ثبوت میں آپ یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

اَلَّذِينَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِينَ	جن لوگوں کی جانیں فرشتے اس وقت نکالتے ہیں

يَقُوْلُوْنَ سَلَامٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶/۳۲)

جب کہ وہ پاک ہوتے ہیں۔ ان سے کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو جنت میں داخل ہو اپنے ان کاموں کے بدلے میں جو تم کرتے تھے

یہی آیت مولوی ابوالوفا ثناء اللہ صاحب نے میرے جواب میں لکھی تھی۔ جس کو اپنے مضمون میں تفصیل کے ساتھ میں ثابت کر چکا ہوں کہ یہ دار آخرت کے متعلق ہے نہ کہ برزخ کے۔ پوری آیت یہ ہے

وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۔ وَلَنِعْمَ دَارُ
الْمُتَّقِيْنَ ۔ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا
مَا يَشَاۗءُوْنَ ۔ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ
الْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ
طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا
الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۔ (۱۶/۳۲)

اور بے شک آخرت کا گھر بہتر ہے، اور کیسا اچھا گھر ہے پرہیزگاروں کا۔ ہمیشہ رہنے والے باغات ہیں وہ جن میں داخل ہوں گے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یونہی اللہ پرہیزگاروں کو بدلہ دیگا جن کی جانیں ملائکہ اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ پاک ہوتے ہیں کہیں گے کہ تمہارے اوپر سلامتی ہو تم اپنے عمل کے بدلہ جنت میں داخل ہو۔

یہ ہرگز صحیح نہیں ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی پرہیزگار جنت میں داخل ہو جاتے ہیں اور گنہگار دوزخ میں (۱۰) بلکہ یہ داخلہ قیامت کے دن حساب کتاب کے بعد ہوگا جس کی تصریح جابجا قرآن میں کی گئی ہے۔ سورۂ زمر میں ہے۔

ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ
يَّنْظُرُوْنَ ۔ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ
رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْۗءَ بِالنَّبِيّٖنَ
وَالشُّهَدَاۗءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ
وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا

پھر دوبارہ نفخ صور ہوگا اور ایک دم وہ کھڑے ہو جائیں گے دیکھتے ہوئے۔ اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی اور کتاب رکھی جائے گی اور انبیاء اور گواہ لائے جائیں گے اور ان (حاضرین) میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائیگا۔ اور ان پر ظلم نہیں ہوگا۔ اور ہر شخص نے

مَا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۔ وَ سِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ	جو کچھ کیا اس کو پورا پورا دیا جائے گا۔ اور اللہ اچھی طرح جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ اور کفار ہانکے جائیں گے جہنم کی طرف گروہ۔ گروہ۔
وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ (۷۳/۳۹)	اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں وہ جنت کی طرف گروہ گروہ لائے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب وہ وہاں آجائیں گے اور اس کے دروازے کھول دئے جائیں گے تو اس کے نگہبان کہیں گے کہ تم پاک ہوئے جنت میں داخل ہو ہمیشہ کے لیے۔

آیت بالا میں متقیوں کے لیے دخول جنت اور کفار کے لیے دخول نار قیامت کے دن حساب کتاب کے بعد ہے۔ اب جہاں قرآن میں یہ مضمون آئے گا اسی تصریح کے مطابق سمجھا جائے گا۔ اور یہی قرآن مجید کا دستور رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر وہ موت کے ساتھ ہی ساتھ جزا و سزا کا ذکر کر دیتا ہے جس کو وہ شخص جو قرآن فہمی کے اصول سے واقف ہے صاف صاف سمجھتا ہے کہ یہ قیامت کے دن کا حال ہے مگر جو شخص قرآن کے طرز بیان سے آشنا نہیں وہ اس کو اسی وقت پر محمول کرتا ہے اور غلطی کھا جاتا ہے۔ (۱۱)

۵۔ موت کے ساتھ ہی گنہگاروں کے جہنم میں داخل ہونے کا ثبوت آپ نے مندرجہ ذیل آیت سے پیش کیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ۪ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰۤى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ فَادْخُلُوْۤا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا (۲/۱۶)	وہ جن کی جانیں فرشتے اس حالت میں نکالتے ہیں کہ وہ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے تو وہ صلح (کی طرح) ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو کوئی برائی نہیں کرتے تھے۔ ہاں اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے تھے۔ سو تم جہنم کے دروازوں میں داخل ہو ہمیشہ اس میں رہوگے۔

لیکن تعجب ہے کہ آپ نے یہ نہ دیکھا کہ اس آیت میں تو صاف صاف قیامت کے دن کی تصریح ہے۔ پوری آیت یہ ہے۔

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا۔	پھر اللہ ان کو قیامت کے دن رسوا کرے گا اور کہیگا کہ کہاں ہیں میرے وہ شرکا جن کے بارے میں تم ضد کرتے تھے۔ جن کو علم دیا گیا ہے۔ وہ کہیں گے کہ آج کے دن رسوائی اور برائی ہے ان کافروں پر جن کی جانیں فرشتے اس حالت میں نکالتے ہیں کہ وہ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے تو وہ صلح (کی طرح) ڈالتے ہیں کہ ہم تو کوئی برائی نہیں کرتے تھے۔ ہاں! اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے تھے۔ سو تم جہنم کے دروازوں میں داخل ہو ہمیشہ اس میں رہو گے

یہ تو آپ کی دلیل بالکل آپ کے مدعا کے خلاف اور میرے مدعا کے مطابق ہے۔ (۱۲ام

۶۔ صفحہ ۴۴۳ سے صفحہ ۴۴۵ تک آپ نے مردوں کی روحانی زندگی کا جو فلسفہ بیان کیا ہے اور شہیدوں اور غیر شہیدوں کی موت کا یکساں اندازہ لگایا ہے! جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ وہی ہے جو مولنا سورتی علیہ الرحمۃ نے میرے جواب میں معارف میں تراشا ہے اور جن کی فلسفیانہ قابلیت سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ آپ نے ان سے بھی دو قدم آگے بڑھایا ہے اور لکھا ہے کہ

"تمام مرنے والوں کے لیے عرفی موت کے بعد بھی ایک روحانی زندگی ہے جس میں احساس شعور سمع اور گویائی وغیرہ قوتیں بدستور باقی رہتی ہیں"

یہ حقیقت میں محض قیاس آرائی ہے اور قرآن کے سراسر خلاف ہے قرآن نے شہیدوں کے متعلق تصریح

کی ہے کہ :-

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ (۲/۱۵۴)	اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں ۔

اور غیر شہیدوں یہانتک کہ ان بزرگوں کے متعلق جن کو مشرکین پوجتے ہیں فرمایا ہے۔

اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (۱۶/۲۱)	مردہ ہیں زندہ نہیں ہیں اور ان کو پتہ نہیں ہے کہ کب اٹھائے جائیں گے ۔

یعنے ان کو صرف اموات کہنے پر اکتفا نہ کی بلکہ غیر احیا کہہ کر ظاہر کر دیا کہ حیات کا مطلقًا کوئی شائبہ ان میں باقی نہیں ہے۔ اور اس کے ساتھ شعور کی بھی ان سے نفی کر دی (۱۳)۔ مندرجہ ذیل آیات میں ان کی غفلت یعنے عدم علم اور عدم سمع کی بھی تصریح ہے ۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ (۴۶/۵)	اس سے بڑھکر گمراہ کون ہے جو اللہ کے سوا ان کو پکارتا ہے جو قیامت تک اس کو جواب نہیں دینے کے اور وہ ان کی پکار سے بیخبر ہیں ۔
وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ؕ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ (۳۵/۱۴)	اور اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں ہیں۔ اگر تم ان کو پکاروگے تو وہ تمہاری پکار نہیں سنیں گے ۔

قرآن کی ان کھلی ہوی تصریحات کے ہوتے ہوے غیر شہید مُردوں میں زندگی شعور سمع اور گویائی تسلیم کرنا اور پھر ان کی حالت کو شہیدوں کے ساتھ یکساں اندازہ کرنا دراصل قرآن کا انکار ہے جس سے ایک مسلمان کو لرزنا چاہیے ۔ (۱۴) ۔

۷- اب اس آیت کو لیجیے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا۔ (۵۸/۲۲)

اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر وہ قتل کیے گئے یا مر گئے تو اللہ ان کو ضرور اچھی روزی دے گا۔

وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِالَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ (۱۵۷/۳)

اور خواہ تم مرو یا مارے جاؤ ضرور اللہ ہی کی طرف اٹھائے جاؤ گے۔

ان آیتوں میں آپ نے حاشیہ لکھا ہے کہ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام صالحین کے ساتھ ایک ہی معاملہ ہوتا ہے اور اس میں شہید اور غیر شہید کا کوئی فرق نہیں۔ یہی آیتیں معارف والوں نے بھی استدلال میں پیش کی تھیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ بحث اس امر میں تو نہیں ہے کہ صالحین کو رزق حسن نہیں ملے گا یا یہ کہ وہ اپنے رب کے پاس محشور نہیں ہوں گے۔ مدار بحث تو برزخ ہے اس کے خلاف ان میں سے کیا دلیل نکلی؟ پہلی آیت میں شہیدوں اور غیر شہیدوں کے صرف نتائج بیان کیے گئے ہیں ان کے اوقات کا ذکر نہیں کیا گیا۔ کیونکہ ان کی تصریح دوسری آیت میں ہو چکی ہے کہ شہیدوں کو مرنے کے بعد ہی زندگی اور رزق حسن مل جاتا ہے اور غیر شہید صالحین کو قیامت کے دن ملے گا (۱۵)۔ یہی صورت دوسری آیت کی ہے جس میں شہیدوں اور غیر شہیدوں کے حشر کی تصریح کی گئی ہے جس پر ہر مسلمان ایمان رکھتا ہے اور کبھی اس سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میرے معترضین کو غلط فہمی اس وجہ سے ہوئی ہے کہ وہ قرآن کریم کے اس اصول سے آشنا نہیں ہیں کہ وہ مختلف امور کو مختلف آیات اور مقامات میں طے کرتا ہے۔ ایک ہی آیت میں ہر چیز کا فیصلہ نہیں کر دیتا۔

۸۔ سورہ یٰسین میں ایک مومن کا قصہ بیان کیا گیا ہے کہ جونہی اس نے اپنے ایمان کا اعلان کیا اور کہا۔

اِنِّیْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ (۲۵/۳۶) سن رکھو کہ میں تمہارے رب پر ایمان لے آیا۔

اسی وقت اس کی قوم نے جو کافر تھی اس کو قتل کر ڈالا۔ اس کے بارے میں ہے۔

قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ۔ قَالَ يَا لَيْتَ قَوْمِي اس سے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جا۔ اس نے کہا
يَعْلَمُونَ بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي کاش میری قوم کو علم ہوتا اس کا جو اللہ نے میری مغفرت
مِنَ الْمُكْرَمِينَ (۳۶/۲۶) کی اور مجھے معززین میں شامل کر دیا۔

میں نے اس شخص کو شہید لکھا ہے۔ اس پر آپ حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ۔

"قرآن میں اس شخص کے مارے جانے کا ذکر نہیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے قتل کر دیا گیا تھا۔ جو شخص روایات کو ظنی اور ناقابل اعتبار سمجھتا ہو اس کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ اس شخص کو جنت میں داخل ہونے کا حکم مرنے کے بعد دیا گیا"

یہی مطالبہ مجھ سے مدیر صاحب معارف کا ہے کہ تم قرآن سے اس کو شہید ثابت کرو۔

حقیقت یہ ہے کہ میں نے جو اس مومن کو شہید قرار دیا ہے تو قرآن ہی کی بنا پر قرار دیا ہے نہ کہ روایات پر۔ کیونکہ قرآن سے اس کے شہید ہونے کا ثبوت بالکل کھلا ہوا ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں شہیدوں کی دو خصوصیتیں بتائی گئی ہیں ایک تو "عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ"۔ اور دوسری۔ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ یعنے جو کچھ اللہ نے اپنی مہربانی سے ان کو دیا ہے اس پر مسرور ہیں۔ سورہ یٰسین کے مرد مومن کے لیے کہا گیا ہے "اُدْخُلِ الْجَنَّةَ" جو "يُرْزَقُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ" کی تفسیر ہے اور پھر اس نے مسرور ہو کر کہا کاش میری قوم جانتی جو اللہ نے میری مغفرت کی اور مجھے سربلندوں میں شامل کیا" یہ دوسری خصوصیت کا مفہوم ہے۔ اب چونکہ شہیدوں کی دونوں خصوصیات اس میں پائی گئیں اس لئے قرآن سے قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ وہ شہید تھا۔ (۱۲)

حاشیہ میں آپ نے جو یہ لکھا ہے کہ "جو شخص حدیث کو ناقابل اعتبار سمجھتا ہو" میری نسبت

یہ صحیح نہیں ہے میں حدیثوں کو تاریخی حد تک قابل اعتبار سمجھتا ہوں بشرطیکہ اس کی صحت کے شواہد موجود ہوں۔

یہاں یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اصولاً آپ حضرات کا یہ مطالبہ مجھ سے صحیح نہیں تھا۔ اس لیے کہ جو شخص حدیثوں کو دینی حیثیت سے قابل احتجاج سمجھتا ہو اس کے اوپر اس سے حجت لائی جا سکتی ہے اور اس کو اس کی قبولیت سے انکار کا حق نہیں پہونچتا۔

۹۔ ص ۲۴۷ میں حاشیہ میں آپ لکھتے ہیں کہ

"صالحین وابرار کے نام اس دفتر میں لکھے جاتے ہیں جو علیین کے لیے مخصوص ہے اور فاسقین و فجار کے نام سجین کے دفتر میں مندرج ہوتے ہیں اس کے یہ معنی نہیں کہ نفوس فنا ہو جاتے ہیں اور صرف رجسٹر میں نام رہ جاتے ہیں بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کی روحیں علیین وسجین میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ مدرسہ میں بچہ کا نام لکھا گیا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بچہ غائب ہو گیا اور صرف اس کا نام رجسٹر میں رہ گیا"

"اِنَّ كِتَابَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ" کا یہ ترجمہ کہ ابرار کے نام اس دفتر میں لکھے جاتے ہیں۔ جو علیین کے لیے مخصوص ہے عربیت کے لحاظ سے کس قدر عجیب ہے! پھر یہ کہنا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی روحیں بھی علیین وسجین میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اور زیادہ عجیب آخر یہ کس دلیل سے؟ کوئی آیت پیش کیجئے۔ قرآن میں تو صرف یہ ہے۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى قَالَ فرعون نے پوچھا کہ گذشتہ نسلوں کا کیا حال ہے؟ موسیٰ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتَابٍ (طٰہٰ) نے کہا کہ انکا علم میرے رب کے پاس نوشتہ میں ہے۔

قرآن تو صاف تصریح کر رہا ہے کہ گزشتگان کا علم رب کے نوشتہ میں مندرج ہے۔ پھر آپ اس سے

آگے بڑھکر یہ کہنے کا کیسے حق رکھتے ہیں کہ علم ہی نہیں بلکہ روحیں بھی اس میں داخل ہیں۔ اور حیرت یہ ہے کہ اس بحث میں جو خالص قرآن سے ہو رہی ہے آپ آیات کے بالمقابل دلیل بھی پیش کرتے ہیں تو دلیل تمثیلی جس کی کوئی منطقی حیثیت نہیں ہے۔ اور تمثیل بھی مردوں کی زندوں پر۔ (۱۷)

۱۰۔ آل فرعون کے عذاب نار کے متعلق میں نے قرآنی آیات سے ثابت کر دیا کہ "یعرضون" کے معنی حال کے نہیں لیے جا سکتے بلکہ استقبال کے ہیں جیسا کہ سورۂ احقاف میں ہے۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا (۲۰/۴۶)

اور جس دن کفار آگ پر پیش کیے جائیں گے ان سے کہا جائے گا کہ تم اپنی لذتیں اپنی دنیاوی زندگی میں اٹھا چکے۔

یہ حیات اخروی کا معاملہ ہے جس میں جملہ کفار جس میں آل فرعون بھی داخل ہیں آگ پر پیش کیے جائیں گے بلکہ آل فرعون کے متعلق خصوصیت کے ساتھ دوسری جگہ تصریح موجود ہے کہ۔

يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ (۹۸/۱۱)

فرعون اپنی قوم کے آگے آگے آئے گا۔ قیامت کے دن اور ان کو آگ میں اتاریگا۔ (۱۸)۔

۱۱۔ صفحہ ۲۲۹ میں آپ نے میرے "غلط نظریے" گنائے ہیں جو آپ کے خیال میں یہ ہیں برزخ مطلق عالم ممات ہے۔ مردوں میں شعور احساس اور علم نہیں ہے اور وہ غافل ہیں۔ قرآن کی رو سے انسان کے لیے دو ہی موتیں ہیں اور دو ہی زندگیاں۔ برزخ کا زمانہ مردوں کو محسوس نہیں ہوتا لیکن دراصل یہ میرے نظریے نہیں ہیں بلکہ قرآن کی کھلی ہوئی تصریحات ہیں جن کو ایک ایک کر کے میں نے اپنے مضمون میں درج کر دیا ہے اور اس جواب میں بھی ع۔۶ میں لکھدیا ہے۔ اب اس پر سوائے اس کے میں کیا کر سکتا ہوں کہ یہ آیت پڑھوں (۱۹)۔

فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ

حقیقت میں وہ تجھے نہیں جھٹلاتے ہیں بلکہ یہ ظالم

بِاٰیٰتِ اللّٰہِ یَجۡحَدُوۡنَ (پ۱۰) - اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔

۱۲- ص۲۱۵ میں ان آیات کے متعلق جو میں نے اس امر کو ثابت کرنے کے لیے پیش کی ہیں کہ قرآن میں سوائے دنیا اور آخرت کے عذاب و ثواب کے برزخ کے عذاب یا ثواب کا کبھی نام تک نہیں آیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ۔

"ان آیات میں کہیں برزخ کی روحانی زندگی اور اس کے عذاب و ثواب کی نفی نہیں کی گئی ہے۔"

سوال یہ ہے کہ کیا عدم نفی سے بھی کوئی دعویٰ ثابت ہو سکتا ہے؟ میں نے تو متعدد قرآنی دلائل سے برزخ کی روحانی زندگی اور اس کے عذاب و ثواب کے عدم امکان کو ثابت کر دیا ہے پھر عدم نفی کا سوال کہاں باقی رہا۔ (۲۰)

آخر میں آپ نے شہیدوں کے ثواب سے جو برزخ کا ثواب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ بالکل بے محل ہے کیونکہ ہماری بحث برزخ کے متعلق ہے شہیدوں کو ہم نے قرآنی دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ برزخ یعنے آڑ میں نہیں ہیں بلکہ اپنے رب کی حضوری میں ہیں۔ (۲۱)

۱۳- ص۲۱۶ میں آپ نے بھی عذاب برزخ پر وہی دلیل پیش کی ہے جو مدیر معارف نے بڑے شدومد سے لکھی ہے یعنی۔

سَنُعَذِّبُهُمۡ مَّرَّتَيۡنِ ثُمَّ يُرَدُّوۡنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيۡمٍ (پ۱۱)۔ ہم ان کو دو بار عذاب دیں گے پھر وہ بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

اس دو بار عذاب میں سے ایک کو آپ حضرات دنیا کا عذاب قرار دیتے ہیں اور ایک کو برزخ کا۔ اس پر آپ کی دلیل کیا ہے؟ قرآن میں تو برزخ کا لفظ نہیں ہے۔ یہ استدلال حقیقت میں اسی وقت ہو سکتا ہے جب پہلے سے عذاب برزخ کا یقین ہو۔ اسی سورہ میں ہے۔

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ — کیا نہیں دیکھتے کہ ہر سال وہ ایک بار یا دو بار
مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ (۱۲۵/۹) — فتنے میں ڈالے جاتے ہیں۔ پھر بھی باز نہیں آتے۔

جب اللہ ہر سال ان کو ایک دو بار فتنہ میں ڈالتا ہے تو کیا زندگی میں دو بار عذاب نہیں دے سکتا۔ پھر کیسے ثابت ہوا کہ دوسرا عذاب برزخ میں ہوگا۔ اس قسم کی دلیلیں پیش کرنے سے جن کو خود اپنے نفس میں سوچکر انسان سمجھ سکتا ہے کہ ان سے مدعا ثابت نہیں ہوتا محض بیکار دلائل کی تعداد بڑھاتا ہے اور کچھ نہیں۔ (۲۲)۔

جواب بحث

سلہ۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ مردہ پھر دنیا میں آسکتا ہے؟ اصل آیت پر تو غور کیجیے۔ مرنے والا دنیا میں واپس آنا چاہتا ہے۔ اس کے جواب میں ارشاد ہو رہا ہے کہ "ہرگز نہیں۔ اب واپسی نہیں ہو سکتی اس لیے کہ اس کے آگے برزخ ہے، اس دن تک کے لیے جب کہ سب مردے اٹھائے جائیں گے" کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ برزخ جس طرح مردے اور قیامت کے درمیان حائل ہے اسی طرح مردے اور دنیا کے درمیان بھی ہے؟ مگر غضب تو یہ ہے کہ آپ آیت کے الفاظ ہی پر نہیں، خود اپنے الفاظ پر بھی غور نہیں فرماتے۔ آپ خود فرما رہے ہیں کہ "برزخ کے دونوں حدود متعین کر دیے گئے ہیں کہ وہ مرنے والے کی موت سے لیکر حشر تک ہے" اس کے صاف معنی ہیں کہ برزخ کی ابتدائی حد انسان کی دنیوی موت ہے اور آخری حد آخرت کی زندگی۔ جب آخری حد میت اور حیات اُخروی کے درمیان آڑ ہے تو ابتدائی حد میت اور حیات دنیوی کے درمیان آڑ کیسے نہ ہوئی؟

(۲) ہم بھی مانتے ہیں کہ قیامت کے دن سب کی یکجا حاضری ہوگی اور اس لیے ہوگی کہ سب کے اعمال کا حساب لے کر ان کا فیصلہ کیا جائے لیکن اس مجموعی حاضری کے ذکر سے یہ نتیجہ آپ نے کیسے نکال لیا کہ اس سے پہلے فرداً فرداً باوقات مختلفہ جو لوگ مرتے رہتے ہیں وہ خدا کے پاس حاضر نہیں ہوتے اور اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں رکھے جاتے ہیں؟ آپ نے اس نظریہ پر ایک بہت بڑی عمارت اٹھائی ہے لیکن قرآن اس نظریہ کی تائید نہیں کرتا۔ اس کا بیان تو یہ ہے کہ ہر نفس اپنی مدت حیات ختم کر کے خدا ہی کی طرف پلٹتا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا مرجع ہی نہیں ہے کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (۲۹:۶) هُوَ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۱۰:۶) جو شخص مرتا ہے وہ خدا ہی کے پاس جاتا ہے کہیں اور نہیں جاتا موت بجز اس کے کچھ نہیں کہ خدا نے جس جان کو جسم میں ڈالا تھا اسے وہ واپس لے لیتا ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى (۳۹:۵) یہ جان جب جسم سے نکلتی ہے تو خدا ہی کے پاس جاتی ہے قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ (۳۲:۱) لہٰذا اس خیال کی کوئی حقیقت نہیں ہے کہ روحیں وفات پانے کے بعد اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں رکھی جاتی ہیں۔

(۳) ایک ہی سطر اوپر جو کچھ آپ فرما چکے ہیں، یہ بات اس کے خلاف ہے جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ اور اس کی ہم معنی آیات کا اگر وہی مفہوم ہے جو آپ بیان فرما رہے ہیں، تو اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ قیامت سے پہلے کسی کی بھی پیشی نہ ہو اس لیے کہ ان آیات میں جو کچھ کہا گیا ہے کلیت کے ساتھ کہا گیا ہے، اور اس کلی حکم میں کسی کا استثناء نہیں کیا گیا ہے۔ پھر جب آپ کے اعتقاد کے مطابق یہ کلیہ بن گیا کہ پروردگار کے سامنے حاضری کا دن قیامت ہے اور اس سے پہلے حاضری نہیں ہو سکتی، تو قیامت سے پہلے شہداء کا "عِنْدَ رَبِّهِمْ" پہنچ جانا یقیناً اس کے خلاف ہوگا۔ اگر

فی الواقع اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا وہی مقصود ہوتا جو آپ نے اس کی طرف منسوب کیا ہے تو جہاں جہاں یہ کلی حکم بیان کیا گیا ہے وہاں اِلَّا الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ یا کچھ اور کہکر شہدار کا استثنار ضرور کر دیا جاتا۔

(۴) "ان میں روحیں بھی پھونکی نہ گئی تھیں" یہ الفاظ قابل غور ہیں۔ آپ نے میری جو عبارت خود نقل کی ہے اس کو پھر غور سے پڑھیے اور دیکھیے کہ کیا اس کا وہی مفہوم ہے جو آپ نے سمجھا ہے؟ میرا تو واضح مطلب یہ ہے کہ جب روحیں جسموں میں پھونکی نہ گئی تھیں اس وقت بھی وہ اس معنی میں مردہ نہ تھیں کہ ان میں سمع و نطق اور علم و شعور نہ تھا، بلکہ اس حالت میں انسان پر موت کا لفظ صرف اس معنی میں بولا گیا ہے کہ اس کی روح اس کے جسد سے علیٰحدہ تھی۔ روح بجائے خود زندہ ہے۔ اس میں کسی اور روح کے پھونکے جانے کی ضرورت نہیں۔ خود جسم میں بھی زندگی نفخ روح ہی سے ہوتی ہے۔ سمع و بصر، نطق و شعور دراصل روح کے اوصاف ہیں نہ کہ جسم کے جسمانی اعضار تو روح کے لیے محض آلات ہیں جن سے اس کے اوصاف کا ظہور ایک خاص طور پر ہوتا ہے۔ اگر یہ آلات نہ ہوں تب بھی روح ایک دوسرے طور پر دیکھ اور سن سکتی ہے، بول اور سمجھ سکتی ہے۔ دیکھنا، سننا، بولنا اور سمجھنا اگر صرف جسمانی کان، آنکھ، دماغ اور زبان پر منحصر ہو، اور ان کے بغیر یہ اوصاف کسی میں متحقق نہ ہو سکتے ہوں، تو آپ خدا کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں؟ وہ آلات جسمانی رکھتا ہے؟ یا آلات کے بغیر ان اوصاف سے عاری ہے؟

(۵) قرآن مجید کے صاف الفاظ یہ ہیں کہ بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی ذریت نکالی گئی، اللہ نے ان کے اوپر خود انہی کو گواہ بنا کر پوچھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے کہا ہاں، ہم گواہی دیتے ہیں۔ یہ ایک دوسرا سوال ہے کہ ذریت کے نکالے جانے اور اللہ تعالیٰ سے ان کا سوال و جواب ہونے کی کیفیت کیا تھی، لیکن اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے اس سے اتنا صاف ظاہر ہوتا ہے

کہ کسی نہ کسی طور پر ذریت نکالی گئی، اور اس سے سوال و جواب ہوا۔ اگر بات صرف اتنی ہوتی کہ اللہ کی معرفت انسان کی سرشت میں رکھدی گئی ہے، تو اس مفہوم کو واضح طور پر ادا کرنے کے لیے ایسے الفاظ استعمال نہ کیے جاتے جن کا واضح مفہوم یہ نہیں ہے۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کے پاس معانی کو ادا کرنے کے لیے الفاظ کا اتنا ذخیرہ بھی نہیں جتنا خود آپ کے پاس ہے؟ یا آپ کا یہ خیال ہے کہ نعوذ باللہ حضرت حق کو کچھ پیچیدہ زبان ہی میں بات کرنے کی عادت ہے۔

(۶) بعید نہیں کہ سمٰوٰت و ارض اور پہاڑوں میں بھی ایک طرح کی حیات ہو جس کا علم ہمکو نہ ہو۔ اور یہ بھی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے کلام بھی کرتا ہو جس کی کیفیت ہم سمجھنے سے قاصر ہوں۔ ہمارا اور آپ کا علم اور اس کے ذرایع محدود ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کا علم اور اس کی قدرت غیر محدود ہے۔ ہم جن چیزوں کو مردہ، اور نطق و گویائی سے بالکل عاری سمجھتے ہیں، ضروری نہیں کہ وہ حقیقت میں بھی ایسی ہی ہوں اور اگر وہ ایسی ہوں بھی تو اللہ ہر وقت ان کو سمع اور گویائی کی قوت بخش سکتا ہے۔ کان، یہ اور آنکھیں اور کھالیں جن کو آپ گویائی کے ناقابل پاتے ہیں، یہی ایک وقت انسان کے خلاف گواہی دیں گی، اور جب انسان اس پر تعجب کریگا تو وہ کہیں گی کہ اَنْطَقَنَا اللّٰہُ الَّذِیْ اَنْطَقَ کُلَّ شَیْءٍ (ہم کو اس خدا نے گویا کر دیا ہے جس نے ہر چیز کو گویا کیا۔ (۴۱ : ۲۱)۔ زمین و آسمان کی اشیاء میں سے بہت سی چیزیں جن کے اندر آپ کے نزدیک حیات کا شائبہ تک نہیں، اللہ کی تسبیح کرتی ہیں، مگر آپ کے پاس وہ ذرائع نہیں جن سے آپ ان کی تسبیح سن اور سمجھ سکیں۔ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ (کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کی حمد میں تسبیح نہ کرتی ہو، مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔ ۱۷ : ۵) اس مردہ زمین اور ان بے جان سمٰوٰت کے متعلق آپ یہ گمان کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ انھوں نے بھی کبھی خدا سے کلام کیا ہوگا۔ لیکن خدا ان سے کلام کر چکا ہے اور یہ اس کو جواب دے چکے ہیں۔ ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ وَھِیَ

دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ (۴۱:۲)
آپ ان سب کی تاویل کرسکتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حق کے جس سچے اور کامل علم کے ساتھ کلام فرماتا ہے وہ علم ہم کو حاصل نہیں ہے، اور اپنے ناقص و محدود علم کی بنیاد پر ہم اس کے کلام کی جو تاویلات کرتے ہیں ان کی حقیقت اندھیرے میں نشانہ بازی کرنے سے کچھ بھی زیادہ نہیں
(۷) اس سے پہلے .... میں اس بنیاد کو پھر مستحکم کیا جاچکا ہے، لہٰذا میرے چڑھائے ہوئے ردّے بدستور قائم ہیں۔

(۸) مُردہ کہہ رہا ہے کہ "پروردگار مجھ کو واپس کر دیجیے۔ امید ہے کہ میں جو کچھ چھوڑ چکا ہوں اس میں نیک عمل کروںگا" اللہ فرمارہا ہے کہ "ہرگز نہیں! یہ تو ایک بات ہے جو تو کہہ رہا ہے۔ اب تیرے آگے ایک آڑ ہے اس دن تک جب کہ سب مردے اٹھائے جائیں گے"۔ لیکن آپ فرمارہے ہیں کہ نہیں مردہ ابھی وہیں ہے، جہاں وہ واپس آنے کی استدعا کر رہا ہے، اور ابھی اس نے وہ چیز چھوڑی نہیں ہے جس میں وہ نیک عمل کرنے کی امید رکھتا ہے، اور ابھی وہ آڑ حائل نہیں ہوئی ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں واپس کرنے سے انکار کر رہا ہے۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ ہم آپ کی بات مانیں یا اللہ کی اور اس شخص کی جس پر خود یہ کیفیت بیت رہی ہے؟

(۹) بلاشبہ بعض آیات کی آپ یہ تاویل بھی کرسکتے ہیں لیکن اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْ أَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ کی یہ تاویل کرنا کہ یہ گفتگو قبض روح کا فعل پورا ہونے سے پہلے کی ہے تاویل کی حد سے گذر کر تحریف کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ لفظ تَوَفّٰهُمْ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ قبض روح کا فعل پورا ہوچکا اور میت سے فرشتوں کی گفتگو اس کے بعد ہوئی۔

(۱۰) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے متقین کا انجام بیان کرتے ہوئے پہلے وہ انعامات بیان کیے ہیں جو دار آخرت میں ان پر ہونگے، پھر یہ بتایا ہے کہ ایسے لوگوں پر خدا کے انعامات اسی وقت سے

شروع ہوجاتے ہیں جب ان کی روحیں قبض کی جاتی ہیں، اور خدا کی طرف سے اس کے فرشتے اسی
وقت ان کو سلامتی اور دخول جنت کا مژدہ سنا دیتے ہیں۔ تتوفٰھم کے بعد ہی یقولون کہنے
سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قبض روح کے ساتھ ہی ملائکہ یہ بات پرہیزگار لوگوں سے کہدیتے
ہیں۔ اگر قبض روح کا فعل اس وقت ہو، اور ملائکہ کی یہ گفتگو قیامت کے وقت، تو اس مضمون
کو ادا کرنے کے لیے وہ انداز بیان نہیں ہوسکتا جو قرآن مجید میں اختیار کیا گیا ہے۔ غالباً
یہاں آپ پھر اپنے اس نظریے سے کام لیں گے کہ موت اور قیامت میں فصل زمانی نہیں ہے،
اور مردے کے لیے قبض روح کا فعل اور قیامت کے دن ملائکہ کی یہ گفتگو دونوں گویا ایک ہی
وقت میں ہوتے ہیں لیکن اس نظریے سے آپ میرے مقابلہ میں اس وقت تک کوئی کام نہیں
لے سکتے جب تک آپ میرے اُن اعتراضات کو رفع نہ کردیں جو میں نے اس نظریے پر کیے ہیں۔
جو چیز میرے نزدیک مسلم ہی نہیں ہے اس سے آپ میرے مقابلہ میں استدلال کیسے کرسکتے ہیں؟

(۱۱) جو لوگ قرآن فہمی کے اصول سے واقف ہیں وہ قیامت کے حال کو قیامت کا حال اور
برزخ کے حال کو برزخ کا حال سمجھتے ہیں۔ قرآن کے صاف و صریح بیان کے باوجود برزخ کے حال
کو قیامت کا حال سمجھنا قرآن فہمی نہیں ہے۔

(۱۲) اس آیت کی بھی وہی تاویل ہے جو نمبر ۱ میں بیان کی گئی ہے۔ یہاں ظالمین کے عذاب
آخرت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ یہ عذاب ان پر قبض روح کے وقت ہی سے شروع ہوجائیگا
وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ وَ
ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ (۸ : ۷) اور وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ
وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُوٓا أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوٓا أَنفُسَكُمُ (۶ : ۱۱) سے اس تاویل کی تائید ہوتی
ہے کہ ظالمین پر قبض روح کے وقت ہی سے سختیاں شروع ہوجاتی ہیں۔

(۱۳) مقتولین فی سبیل اللہ کے حق میں موت کی نفی اور حیات کے اثبات کی اصل غرض میں بیان کرچکا ہوں۔ مشرکین کے معبودوں کے حق میں حیات کی نفی اور موت کے اثبات کی غرض بھی ظاہر ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ تم قادر مطلق خدا کو چھوڑ کر ان بےچاروں کو کیا پکارتے ہو جو کسی چیز کو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں، اور یہ بھی نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے ان کو اموات غیر احیاء کہنے کی غرض صرف ان کی بےچارگی اور عدم قدرت پر زور دینا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر وہ زندہ بھی ہوں تب بھی ان میں نہ کسی شئے کو خلق کرنے کی قدرت ہو سکتی ہے اور نہ ان کے پاس یوم البعث کا علم ہو سکتا ہے۔ اس قسم کی آیات سے آپ شہداء اور غیر شہداء کی موت و حیات کے درمیان کوئی اصولی فرق ثابت نہیں کر سکتے۔ شہداء کو زندہ کہنے کا مطلب اگر آپ یہ لیتے ہیں کہ عرف عام میں جس کو موت کہتے ہیں وہ ان پر طاری نہیں ہوتی تو ان کو دفن کرنا، اور ان کا ترکہ تقسیم کرنا اور ان کی بیویوں کا نکاح ثانی کرنا سب کچھ ناجائز ہوگا۔ لیکن اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ جسمانی موت ان پر طاری ہوتی ہے، اور جس زندگی کا ان کے لیے اثبات کیا گیا ہے، وہ جسمانی نہیں بلکہ روحانی زندگی ہے، تو آپ نے گویا یہ تسلیم کر لیا کہ قرآن مجید میں موت کا لفظ اس چیز کا مترادف نہیں ہے جس کو آپ مطلق ممات کہتے ہیں، اور جسمانی حیات کے سوا بھی کسی زندگی کو قرآن لفظ حیات سے تعبیر کرتا ہے۔ برزخ میں تمام مردوں کے لیے جو زندگی ہم ثابت کر رہے ہیں وہ یہی زندگی ہے، اور آپ قرآن مجید سے کوئی ایسی آیت پیش نہیں کر سکتے جو اہل برزخ کے حق میں اس زندگی کی نفی کرتی ہو۔

(۱۴) قرآن کے انکار سے تو ہم ضرور لرزتے ہیں، مگر کسی انسان کے مزعومات سے انکار کرنے میں ہم کو لرزنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ آپ جو آیتیں اس وقت پیش فرما رہے ہیں اور جو اس سے پہلے پیش کر چکے ہیں، وہ زیادہ سے زیادہ یہی ثابت کرتی ہیں کہ اہل برزخ دنیا والوں کی باتیں نہ سن سکتے ہیں نہ ان کو جواب دے سکتے ہیں، اور نہ ان کے احوال سے واقف ہیں۔ اس کے

بعد یہ آپکا اپنا اضافہ ہے کہ اہل برزخ جب دنیا والوں سے بات چیت نہیں کر سکتے اور ان کے حالات کا علم نہیں رکھتے تو ان میں سرے سے بولنے اور سننے اور علم رکھنے کی قوت ہی نہیں ہے۔ قبل اس کے کہ آپ اپنے اس اضافے پر ہم کو ایمان لانے کی دعوت دیں، آپ کو قرآن سے اس کا ثبوت دینا چاہیے کہ اہل برزخ فی انفسہم سننے اور بولنے اور علم رکھنے کی قوتوں سے محروم ہیں۔ ورنہ جس طریقے سے آپ استدلال کر رہے ہیں، اس کی پیروی کرکے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ دہلی کی ساری آبادی مطلق عالم ممات میں ہے، کیونکہ وہ نہ حیدرآباد والوں کی باتیں سن سکتی ہے، نہ ان کو جواب دے سکتی ہے، نہ اُن کے احوال کا علم رکھتی ہے۔

۵۔ آپ نے غور نہیں فرمایا کہ شہیدوں کے حق میں عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ کی جو تخصیص آپنے کر دی ہے اس کو یہ دونوں آیتیں تمام ان لوگوں کے حق میں عام کر رہی ہیں جو خدا کی راہ میں ہجرت کرتے ہیں یا دین کی خدمت کرتے ہوئے وفات پاتے ہیں۔ جن آیات میں صرف مقتولین فی سبیل اللہ کے مدارج کا ذکر ہے ان میں یہ تو نہیں کہا گیا ہے کہ یہ مدارج انہیں کے لیے مخصوص ہیں، کسی دوسرے کو نہیں مل سکتے۔ لیکن جب وہاں اس کی نفی نہیں ہے، اور یہاں مقتولین اور غیر مقتولین دونوں کے مدارج کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے، تو ظاہر ہو گیا کہ خدا کے پاس حاضر ہونے، اور پسندیدہ منازل میں داخل کیے جانے، اور عمدہ رزق پانے میں ان دونوں کے درمیان کسی قسم کا تقدم و تاخر نہیں ہے۔ تقدم و تاخر کا حکم آپ نے صرف اس بنا پر نکال لیا ہے کہ ایک گروہ کو اموات کہا گیا ہے اور دوسرے کو احیاء۔ لیکن ہم ثابت کر چکے ہیں کہ جسمانی موت کے اعتبار سے دونوں اموات ہیں۔ اور روحانی حیات کے اعتبار سے دونوں احیاء۔ البتہ ایک بڑی مصلحت سے مقتولین فی سبیل اللہ کو مردہ کہنے کی ممانعت کی گئی ہے اور ان کی حیات روحانی کا اثبات کیا گیا ہے، جس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ حیات روحانی صرف شہداء کے لیے مخصوص ہے اور ان کے سوا تمام انبیاء و صدیقین و صالحین

اس زندگی سے بالکل محروم ہیں۔

(۱۶) آپ نے یہ کیوں نہ سمجھا کہ اس سے قیامت کے روز ایسا کہا جائے گا، اور اسی روز وہ مسرور بھی ہوگا؟ آپ برزخ کا غیر زمانی ہونا تو ثابت کر ہی چکے ہیں۔ اور حَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ اور اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا میں ماضی کو مستقبل کا ہم معنی بھی قرار دے چکے ہیں۔ ان مراحل کو طے کر لینے کے بعد تو آپ کے لیے کوئی وجہ نہ تھی کہ اس مرد صالح کو شہید قرار دینے کے لیے اتنا تکلف کرتے۔

(۱۷) عربیت کے لحاظ سے علیّین کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ یا تو اس سے مراد منازل عالیہ ہیں یا ان منازل کے رہنے والے، مگر موخر الذکر معنی زیادہ صحیح ہیں۔ اس لیے کہ یہ جمع ناطقین کے لیے مخصوص ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علیین کو کتاب مرقوم فرمایا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ علیین وہ دفتر ہے جس میں نیک لوگوں کے نام لکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح سجین کے بھی لغت میں دو معنی ہیں۔ قید خانہ یا قیدی۔ کتاب کو سجین کہنے سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسی کتاب ہے جس میں قیدیوں کے نام لکھے جاتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ بات عربیت کے لحاظ سے آپ کو کیوں عجیب معلوم ہوئی؟ رہا یہ سوال کہ نام درج ہونے کے ساتھ ابرار و فجار کی روحیں بھی علیین و سجین میں داخل ہو جاتی ہیں، تو اس کا ثبوت قرآن میں موجود ہے۔ حضرت ادریس کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا (۱۹ : ۴)۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ادریس کا صرف نام ہی علیین میں نہیں لکھا گیا بلکہ ان کو ایک مقام بلند دے بھی دیا گیا۔ اسی طرح فجار و ظالمین کے متعلق بھی متعدد آیات نقل کی جا چکی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ان منازل میں داخل ہو چکے ہیں جہاں ان کو عذاب دیا جاتا ہے اس مضمون کو سمجھانے کے لیے جو تمثیل دی گئی تھی وہ استدلال کے طور پر نہ تھی بلکہ محض تفہیم کی غرض سے تھی۔

(۱۸) اس کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے مضمون "برزخ کا ایک گوشہ" میں جو بحث فرمائی تھی، اس کو دیکھ کر مجھے امید تھی کہ آپ مطمئن ہو جائینگے لیکن اس کے جواب میں آپ نے اپنے مضمون "گوشۂ برزخ" میں جو کچھ فرمایا ہے اُسے دیکھ کر معلوم ہو گیا کہ جب انسان "ایک خاص خیال لیکر قرآن میں گھستا ہے" تو وہ آیات میں کیسے کیسے تصرفات کرتا ہے۔ آیت زیر بحث میں صاف طور پر پہلے سوء العذاب کا اور پھر اشدّ العذاب کا ذکر ہے، اور سوء العذاب کا حال بیان کرنے کے بعد قیام ساعت اور اشد عذاب کا ذکر کیا گیا ہے۔ اگر یہ سب کچھ قیامت ہی کا حال ہوتا اور ایک ہی عذاب کے متعلق ہوتا تو جو الفاظ آیت میں وارد ہوئے ہیں وہ بالکل خلاف بلاغت ہوتے لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ یہ نظریات قائم کر چکے ہیں کہ اہل برزخ میں حیات نہیں ہے، اور ان میں زمانہ کا احساس نہیں اور وہ کسی قسم کے عذاب یا ثواب سے اثر پذیری کی صلاحیت نہیں رکھتے اب جو آیت بھی آپ کے سامنے ایسی پیش کی جائے گی جو آپ کے ان نظریات کا ابطال کرنے والی ہو، اس کو دیکھ کر آپ اپنے نظریات میں ترمیم نہ کریں گے، بلکہ آیت کے صاف مفہوم کو ان نظریات ہی کے مطابق بنانے کی کوشش کریں گے۔

(۱۹) دلائل کا یہ جواب تو کوئی معقول جواب نہیں ہے۔ آپ کے نظریات پر میرا اصلی اعتراض تو یہی ہے کہ ان کی تائید میں آپ نے قرآن مجید کی تصریحات پیش نہیں کیں، اور جو آیات پیش کی ہیں وہ آپ کے نظریات ثابت نہیں کرتیں۔ برعکس اس کے میں نے خود قرآن ہی کی آیات پیش کر کے آپ کے ان نظریات کا ابطال کیا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر آپ میرے جواب میں یہ آیت پڑھینگے تو مجھ کو بھی یہ آیت پڑھنی پڑے گی کہ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ۔ (۲: ۹)۔

(۲۰) آپ نے میری پوری عبارت نقل نہیں کی۔ میں نے اس فقرے کے بعد یہ لکھا تھا کہ "ان میں دنیا

آخرت کے عذاب و ثواب کا ذکر اسی طرح ایک واقعہ کے طور پر کیا گیا ہے جس طرح بعض دوسری آیات میں برزخ کی زندگی اور اس کے عذاب و ثواب کا ذکر بطور واقعہ آیا ہے"۔ اس سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ جن آیات میں صرف دنیا اور آخرت کے عذاب و ثواب کا ذکر ہے ان سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ دنیا و آخرت کے سوا کسی جگہ عذاب و ثواب نہیں ہے، اس لیے کہ ان آیتوں میں کہیں اس امر کی تصریح نہیں کی گئی ہے کہ عذاب و ثواب صرف دنیا و آخرت میں ہے، اور ان دونوں کے بیچ میں نہیں ہے۔ رہے وہ "قرآنی دلائل" جن سے آپ نے برزخ کی روحانی زندگی اور اس کے عذاب و ثواب کا عدم امکان ثابت کیا ہے، تو ان دلائل کا قرآنی دلائل ہی ہونا ہمارے اور آپ کے درمیان زیر بحث ہے۔ بجائے اس کے کہ آپ ہمارے اعتراضات رفع کر کے ان کا قرآنی دلائل ہونا ثابت کرتے، آپ اپنے دعوے ہی کو دلیل میں پیش فرما رہے ہیں۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اصطلاح منطق میں اس طرز استدلال کو کیا کہتے ہیں۔

(۲) شہداء کے مسئلہ میں آپ کے مسلک پر جو اشکال وارد ہوتا ہے اس کو آپ بے محل کہکر گریز کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ وہ نہ صرف برمحل، بلکہ آپ کے خلاف ایک قوی اعتراض ہے۔ قرآن میں ایک طرف تمام مردوں کے متعلق کہا ہے کہ وہ قیامت کے دن اٹھائے جائیں گے اور اسی روز ان کے اعمال کا فیصلہ ہوگا۔ دوسری طرف یہ بھی تمام مردوں کے متعلق کہا ہے کہ یوم البعث تک وہ برزخ میں ہیں۔ جہاں جہاں یہ دونوں باتیں کہی گئی ہیں وہاں کسی کے استثناء کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام مرنے والوں کی طرح شہداء بھی قیامت تک برزخ میں ہیں، اور قیامت سے پہلے ان کے لیے کوئی جداگانہ بعث نہیں ہے۔ اب جو قرآن کہتا ہے کہ وہ رب کی حضوری میں ہیں، اور ان کو رزق ملتا ہے تو لامحالہ یہ حضوری اور رزق اسی برزخ میں ہوگا۔ اس سے آپ کے تمام نظریے باطل ہو جاتے ہیں، یعنی اہل برزخ کا بالکل مردہ ہونا، رب کی حضوری سے آڑ میں رہنا اور عذاب و ثواب دونوں سے محفوظ اور محروم رہنا۔

(۲۲) جس طرح دلیل پیش کرنے سے پہلے خود اپنے نفس میں سوچ لینا ضروری ہے اسی طرح دلیل کا رد کرنے سے پہلے بھی انسان کو اپنے نفس میں سوچ لینا چاہیے۔ آپ نے جواب میں جو آیت پیش کی ہے۔ اس کے مضمون پر اگر آپ غور کر لیتے تو آپ کو خود معلوم ہو جاتا کہ اس سے آپکا مدعا ثابت نہیں ہوتا۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ وہ ہر سال ایک بار یا دو بار فتنے میں ڈالے جاتے ہیں اب اگر سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ میں عذاب سے مراد یہی فتنہ میں ڈالنا ہے تو صرف مَرَّتَيْنِ (دو بارہ) کی قید لگانے کے کیا معنی؟ اس سے تو لازم آتا ہے کہ جن کے حق میں سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ کہا گیا ہے وہ زیادہ سے زیادہ ایک سال زندہ رہتے حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہوا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلی آیت میں جس چیز کو عذاب کہا گیا ہے وہ بعینہ وہ چیز نہیں ہے جسے دوسری آیۃ میں فتنہ کہا گیا ہے۔ بلکہ در اصل زندگی کے تمام فتنوں کا مجموعہ ایک مرتبہ کا عذاب ہے۔ اس سے متصل (اور اتصال پر حرف س دلالت کرتا ہے) دوسرا عذاب برزخ کا ہے، اور اس کے بعد عذاب عظیم سے مراد قیامت کا عذاب ہے۔

رسائل و مسائل

تعلیمات قرآن کے متعلق بحث

(۵)

رسالت اور اسکے احکام

چوہدری غلام احمد صاحب پرویز کے مضمون تعلیمات قرآن کے متعلق بحث کا آخری حصہ جو اتباع و اطاعت رسول اور امارت و رسالت کے متعلق تھا محرم ۵۴ھ کے ترجمان القرآن میں شائع ہو چکا ہے۔ وعدہ کیا گیا تھا کہ اس کا جواب صفر کے پرچہ میں دیا جائے گا لیکن عدم گنجائش کے سبب سے اس کو ملتوی کرنا پڑا۔ ناظرین اس مضمون کو ملاحظہ کرنے سے پہلے محرم کے پرچہ میں چوہدری صاحب کا مضمون ایک نظر دیکھ لیں۔

اطاعت رسول کے مسئلہ میں یہ امر تو متفق علیہ ہے کہ کوئی رسول اپنی ذاتی حیثیت میں مطاع اور متبوع نہیں ہوسکتا۔ نہ موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت اور پیروی اس بنا پر ہے کہ وہ موسیٰ بن عمران ہیں، نہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام اس وجہ سے لائق اطاعت و اتباع ہیں کہ وہ عیسیٰ بن مریم ہیں، اور نہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اس حیثیت سے لازم ہے کہ آپ محمد بن عبداللہ ہیں۔ اطاعت اور پیروی جو کچھ بھی ہے صرف اس حیثیت سے ہے کہ یہ حضرات اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ نے ان کو وہ علم حق عطا کیا جو عام انسانوں کو عطا نہیں کیا اور ان کو وہ ہدایت بخشی جو عام لوگوں کو نہیں بخشی اور ان کو دنیا

میں اپنی رضا کے مطابق زندگی بسر کرنے کے وہ صحیح طریقے بتائے جن کو عام لوگ اپنی عقل و رائے یا ان کے سوا دوسرے لوگوں کی رہنمائی سے معلوم نہیں کر سکتے۔ اب اختلاف جس امر میں واقع ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول خدا کی اطاعت اور پیروی کس امر میں ہے اور کس حد تک ہے؟

ایک گروہ کہتا ہے کہ اطاعت اور پیروی صرف اس کتاب کی ہے جو اللہ کی طرف سے اس کا رسول لے کر آتا ہے تبلیغ کتاب کے بعد رسول کی حیثیت رسالت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر وہ بھی ویسا ہی ایک انسان ہے جیسے اور دوسرے انسان ہیں۔ دوسرے انسان اگر امیر اور سردار قوم ہوں تو محض نظم وضبط (Discipline) کے لیے ان کی اطاعت لازم ہوگی۔ مگر مذہبی فریضہ نہ ہوگی۔ دوسرے انسان اگر عالم، حکیم یا مقنن ہوں تو ان کے اوصاف (Merits.) کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی پیروی کی جائے گی اور یہ پیروی اختیاری ہوگی۔ واجب نہ ہوگی۔ یہی معاملہ رسول خدا کا بھی ہے۔ تبلیغ کتاب کے علاوہ دوسرے تمام معاملات میں رسول کی حیثیت محض شخصی ہے بحیثیت ایک شخص کے اگر وہ امیر ہے تو اس کی اطاعت بالمشافہ ہے نہ کہ دائمی۔ اگر وہ قاضی ہے تو اس کے فیصلے وہیں تک نافذ ہوں گے جہاں تک اس کے حدود قضا (Jurisdiction) ہیں۔ ان سے باہر زیادہ سے زیادہ ایک فاضل جج کی حیثیت سے اس کے فیصلے بطور ایک نظیر کے لیے جائیں گے نہ کہ ایک شارع اور واضع قانون کی حیثیت سے۔ اگر وہ حکیم ہے تو اس کی زبان سے جو حکمت اور اخلاق کی باتیں نکلیں گی وہ اپنی قدر وقیمت کے لحاظ سے قبول کی جائیں گی۔ جس طرح دوسرے حکماء وعقلا کی ایسی ہی باتیں قبول کی جاتی ہیں۔ محض اس بنا پر کہ وہ حامل منصب رسالت کی زبان سے نکلی ہیں، داخل دین نہیں سمجھی جائیں گی۔ اسی طرح اگر وہ ایک نیک سیرت انسان ہے، اور اس کی زندگی اپنے اطوار آداب اور معاملات کے اعتبار سے ایک بہترین زندگی ہے، تو ہم بالاختیار اس کو ایک نمونہ (Model) بنائیں گے، جس طرح ایک غیر نبی کی اچھی زندگی کو نمونہ قرار دینے میں ہم مختار ہیں لیکن اس کا کوئی قول

اور عمل ہمارے لیے اخلاق، معاشرت، معیشت اور معاملات میں ایسا قانون نہ ہوگا جس کی پیروی ہم پر واجب ہو۔ یہ مذہب اس گروہ کا ہے جو آجکل اہل قرآن کہلاتا ہے۔

ایک دوسرا گروہ اس خیال میں تھوڑی سی ترمیم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ رسول کے ذمہ صرف کتاب پہنچا دینا ہی نہ تھا۔ بلکہ کتاب کے احکام پر عمل کر کے دکھا دینا بھی تھا۔ . . . . تاکہ امت اسی نمونہ پر عامل ہو۔ لہذا عبادات وطاعات وغیرہ کے متعلق احکام کتاب کی جو تفصیلی عملی صورت رسول نے بتائی ہے، اس کی پیروی بھی کتاب ہی کی پیروی ہے، اور دینی فرض ہے۔ باقی رہے وہ معاملات جو احکام کتاب کے علاوہ رسول نے اپنی شخصی حیثیت میں، ایک امیر، ایک قاضی، ایک مصلح قوم، ایک حکیم، ایک شہری، اور ایک فرد جماعت کی حیثیت سے انجام دیے، تو ان میں کوئی چیز ایسی نہیں جو ایک دائمی اور عالمگیر ضابطہ وقانون بنانے والی ہو۔ اور جس کی پیروی ہمیشہ کے لیے ایک دینی فرض ہو۔ اس گروہ کے نمایندے جناب مولانا اسلم جیراج پوری ہیں۔

ایک تیسرا گروہ ہے جو رسول کی حیثیت رسالت کو اس کی زندگی کے ایک بہت بڑے حصہ پر حاوی سمجھتا ہے، اخلاق، معاشرت، معاملات، احکام قضایا، اور بہت سے دوسرے معاملات میں اس کے قول اور فعل کا خدا کی جانب سے ہونا تسلیم کرتا ہے، اور یہ بھی مانتا ہے کہ یہ سب چیزیں امت کے لیے اسوۂ حسنہ ہیں، مگر وہ حیثیت رسالت اور حیثیت شخصی میں فرق ضرور کرتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ رسول کی زندگی کے کچھ معاملات ایسے ضرور ہیں۔ جو حیثیت رسالت سے خارج ہیں، اور قابل تقلید نمونہ نہیں ہیں۔ اگرچہ وہ کوئی ایسا واضح خط نہیں کھینچ سکتا جو حیثیت رسالت اور حیثیت شخصی میں بین امتیاز کر دیتا ہو، اور ایک ایسی حد مقرر کرتا ہو جہاں پہنچ کر رسول کی حیثیت محض ایک انسان کی رہ جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ چوہدری صاحب اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور میں ابتدا ہی میں یہ امر واضح کر دینا

چاہتا ہوں کہ ان کا مسلک مقدم الذکر دونوں گروہوں کی بہ نسبت حق سے بہت زیادہ قریب ہے اگرچہ تھوڑی سی غلطی اس میں ضرور ہے لیکن الحمد للہ کہ وہ گمراہی کی حد تک نہیں پہنچی۔

چوتھا گروہ کہتا ہے کہ رسول کی حیثیت شخصی اور حیثیت رسالت اگرچہ اعتبار میں دو جدا گانہ حیثیتیں ہیں، مگر وجود میں دونوں ایک ہی ہیں، اور ان کے درمیان عملاً کوئی فرق کرنا ممکن نہیں ہے منصب رسالت دنیوی عہدوں کی طرح نہیں کہ عہدہ دار جب تک اپنے عہدہ کی کرسی پر بیٹھا ہے عہدہ دار ہے، اور جب اس سے اترا تو ایک عام انسان ہے۔ بلکہ رسول جس وقت منصب رسالت پر سرفراز ہوتا ہے، اس وقت سے مرتے دم تک وہ ہر وقت اور ہر آن مامور (On duty) ہوتا ہے، اور وہ کوئی فعل ایسا نہیں کر سکتا جو اُس سلطنت کی پالیسی کے خلاف ہو جس کا وہ نمائندہ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس کی زندگی کے معاملات عام اس سے کہ وہ امام کی حیثیت سے ہوں یا امیر کی حیثیت سے، قاضی کی حیثیت سے ہوں یا معلم اخلاق کی حیثیت سے، ایک شہری اور سوسائٹی کے ایک فرد کی حیثیت سے ہوں، یا ایک شوہر، باپ، بھائی، رشتہ دار، اور دوست کی حیثیت سے، سب اس کی حیثیت رسالت اس طرح حاوی ہوتی ہے کہ کسی حال میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے منفک نہیں ہوتی، حتیٰ کہ جب وہ اپنی خلوت میں اپنی بیوی کے پاس ہوتا ہے اس وقت بھی وہ اُسی طرح اللہ کا رسول ہوتا ہے جس طرح وہ مسجد میں نماز پڑھاتے وقت ہوتا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں وہ جو کچھ کرتا ہے، اللہ کی ہدایت سے کرتا ہے۔ اس پر ہر آن اللہ کی طرف سے سخت نگرانی قائم رہتی ہے جس کے ماتحت وہ انہی حدود کے اندر چلنے پر مجبور رہتا ہے، جو اللہ نے مقرر کر دی ہیں۔ اگر اس کے پاؤں کو ذرا سی لغزش ہوتی ہے تو اس کو فوراً تنبیہ کی جاتی ہے، کیونکہ اس کی خطا صرف اسی کی خطا نہیں بلکہ ایک پوری امت کی خطا ہے۔ اس کو بھیجنے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان زندگی بسر کر کے ان کے سامنے ایک "مسلم" کی زندگی کا مکمل نمونہ پیش کر دے، اور ان کے انفرادی

واجتماعی معاملات میں اُن کی رہنمائی کرکے نہ صرف ان کو فرداً فرداً "مسلمان" بنائے، بلکہ اسلام کا تمدنی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی نظام قائم کرکے صحیح معنوں میں ایک مسلم سوسائٹی بھی وجود میں لے آئے۔ لہذا اس کا خطا اور غلطی سے محفوظ ہونا لازم ہے، تاکہ کامل اعتماد کے ساتھ اس کی پیروی کی جاسکے، اور اس کے قول وفعل کو بالکلیہ اسلام کی تعلیم اور اسلامیت کا معیار قرار دیا جاسکے اس میں شک نہیں کہ نبی کے اقوال و افعال میں تقلید و تاسی کے لحاظ سے فرق مراتب ضرور ہے بعض وجوب اور فرضیت کے درجہ میں ہیں، بعض استحباب کے درجہ میں، اور بعض ایسے ہیں جن کی حیثیت ذریعۂ استعمال کی ہے لیکن فی الجملہ نبی کی پوری زندگی ایک ایسا نمونہ (Model) ہے جس کو اسی لیے پیش کیا گیا ہے کہ بنی آدم اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔ جو شخص اس نمونہ کی مطابقت میں جتنا بڑھا ہوا ہوگا وہ اتنا ہی کامل انسان اور مسلمان ہوگا، اور جو اس کی مطابقت کے کم سے کم ناگزیر مرتبہ سے بھی گھٹ جائے گا، وہ اپنی کوتاہی کے لحاظ سے فاسق، فاجر، گمراہ اور مغضوب ہوگا۔

میرے نزدیک یہی آخری گروہ حق پر ہے، اور میں قرآن اور عقل کی روشنی میں جتنا زیادہ غور کرتا ہوں اس مسلک کی حقانیت پر میرا یقین بڑھتا جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے جو حالات قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں ان کو دیکھنے سے مجھکو نبوت کی حقیقت یہ نہیں معلوم ہوتی کہ اللہ تعالیٰ یکایک کسی راہ چلتے کو پکڑ کر اپنی کتاب پہنچانے کے لیے مامور کر دیتا ہو، یا کسی شخص کو اس طور پر اپنی پیغامبری کے لیے مقرر کرتا ہو کہ وہ منجملہ اپنے دوسرے کاروبار کے ایک پیغمبری کا کام بھی انجام دے دیا کرے، گویا کہ وہ ایک (Part time servant) ہے جو مقرر اوقات میں ایک مقرر کام کر دیتا ہے اور اس کام کو ختم کرکے آزاد ہوتا ہے کہ جو چاہے کرے۔ برعکس اس کے میں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جب کسی قوم میں نبی بھیجنا چاہا ہے تو خاص طور پر ایک شخص کو اسی کے

پیدا کیا ہے کہ وہ نبوت کی خدمت انجام دے، اس کے اندر انسانیت کی دو بلند ترین صفات اور وہ اعلیٰ درجہ کی ذہنی و روحانی قوتیں ودیعت کی ہیں جو اس سب سے بڑے منصب کو سنبھالنے کے لیے ضروری ہیں، پیدائش کے وقت سے خاص اپنی نگرانی میں اس کی تربیت اور نگرانی کی ہے، نبوت عطا کرنے سے پہلے بھی اس کو اخلاقی عیوب اور گمراہیوں اور غلط کاریوں سے محفوظ رکھا ہے، خطرات اور مہلکوں سے اس کو بچایا ہے، ایسے حالات میں اس کی پرورش کی ہے جنہیں اس کی استعداد بتدریج ترقی کر کے فعلیت کی طرف بڑھتی رہی ہے، پھر جب وہ اپنے کمال کو پہنچ گیا ہے تو اس کو خاص اپنے پاس سے علم اور قوت فیصلہ، اور نور ہدایت عطا کر کے منصب نبوت پر مامور کیا ہے، اور اس سے اس طرح یہ کام لیا ہے کہ اس منصب پر آنے کے بعد سے آخری سانس تک اس کی پوری زندگی اسی کام کے لیے وقف رہی ہے، اس کے لیے دنیا میں تلاوت آیات، اور تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفوس کے سوا کوئی اور شغلہ نہیں رہا ہے، رات دن اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے اس کو یہی دھن رہی ہے کہ گمراہوں کو راہ راست پر لائے اور راہ راست پر آجانے والوں کو ترقی کی اعلیٰ منزلوں پر چلنے کے قابل بنائے، وہ ہمیشہ ایک (Whole time servant) رہا ہے جس کو کبھی چھٹی نہیں ملی اور نہ اس کے لیے کبھی اوقات کار (Working hours) مقرر کیے گئے، اس پر خدا کی طرف سے شدید نگرانی قائم رہی ہے کہ خطا نہ کرنے پائے، ہوائے نفس کے اتباع اور شیطانی وساوس سے اس کی سخت حفاظت کی گئی ہے، معاملات کو اس کی نری عقل اور اس کے اجتہاد پر نہیں چھوڑا گیا، بلکہ جہاں خدا کے مقرر کیے ہوئے خط مستقیم سے اس نے بال برابر بھی جنبش کی ہے وہیں اس کو ٹوک کر سیدھا کر دیا گیا ہے، کیونکہ اس کی پیدائش اور اس کی بعثت کا مقصد ہی یہ رہا ہے کہ خدا کے بندوں کو سواء السبیل اور صراط المستقیم پر چلائے۔ اگر وہ اس خط سے ایک سر مو بھی ہٹتا تو عام انسان میلوں اس سے دور نکل جاتے۔

یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کے لفظ لفظ پر قرآن گواہ ہے۔

یہ بات کہ انبیا علیہم السلام پیدائش سے پہلے ہی نبوت کے لیے نامزد کردیے جاتے ہیں، اور ان کو خاص طور پر اسی منصب کے لیے پیدا کیا جاتا ہے، متعدد انبیاء کے احوال سے معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی پیدائش اور نبوت کی خوشخبری دیدی جاتی ہے۔ وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ وَبَارَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلَىٰ إِسْحَاقَ (۳۷: ۳) حضرت یعقوب کے لیے بھی پہلے ہی سے خبر دی جاتی ہے (وَمِن وَرَاءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ) حضرت یوسف کے متعلق بچپن ہی میں حضرت یعقوب کو معلوم ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو برگزیدہ کرنے اور ابراہیم و اسحاق علیہما السلام کی طرح ان پر اپنی نعمت کا اتمام کرنے والا ہے۔ حضرت زکریا بیٹے کے لیے دعا کرتے ہیں تو ان کو حضرت یحییٰ کی خوشخبری ان الفاظ میں دی جاتی ہے کہ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ (۳: ۴) حضرت مریم کے پاس خاص طور پر فرشتہ بھیجا جاتا ہے کہ ایک پاک طینت لڑکے (غلام زکی) کی خوشخبری دے، اور جب ان کے وضع حمل کا وقت آتا ہے تو خاص حق تعالیٰ کی طرف سے ان کی زچگی کے انتظامات ہوتے ہیں (ملاحظہ ہو سورہ مریم رکوع دوم)۔ پھر اس اسرائیلی چرواہے کو بھی دیکھیے جس سے وادی مقدس طویٰ میں بلا کر باتیں کی گئیں۔ وہ بھی عام چرواہوں کی طرح نہ تھا۔ اسے مصر میں خاص طور پر فرعونیت کو تباہ کرنے اور بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے پیدا کیا گیا۔ اس کو قتل سے بچانے کے لیے ایک تابوت میں رکھوا کر دریا میں ڈلوایا گیا۔ خاص اسی فرعون کے گھر پہنچایا گیا جس کو وہ تباہ کرنے والا تھا۔ اس کو پیاری صورت دی گئی کہ فرعون کے گھر والوں کے دل میں گھر کرلے (وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي)۔ اس کے منہ کو تمام عورتوں کے دودھ سے روک دیا گیا یہاں تک کہ وہ پھر اپنی ماں کی آغوش میں پہنچ گیا اور اس کی پرورش کا انتظام

خاص حق تعالیٰ کی نگرانی میں ہوا (وَ لِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ) یہ چند مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام خاص طور پر نبوت ہی کے لیے پیدا کیے جاتے ہیں۔

پھر اس طرح جن لوگوں کو پیدا کیا جاتا ہے، وہ عام انسانوں کی طرح نہیں ہوتے، بلکہ غیر معمولی قابلیتوں کے ساتھ وجود میں آتے ہیں۔ ان کی فطرت نہایت پاکیزہ ہوتی ہے۔ ان کے ذہن کا سانچہ ایسا ہوتا ہے کہ اس سے جو بات نکلتی ہے سیدھی ہی نکلتی ہے۔ غلط اندیشی اور کج بینی کی استعداد ہی ان میں نہیں ہوتی۔ وہ جبلی طور پر ایسے بنائے جاتے ہیں کہ بلا ارادہ اور بلا کسی غور و فکر کے محض حدس اور وجدان سے ان صحیح نتائج تک پہنچ جاتے ہیں جن پر دوسرے انسان غور و فکر کے بعد بھی نہیں پہنچ سکتے۔ ان کے علوم کسبی نہیں ہوتے، بلکہ جبلی و وہبی ہوتے ہیں۔ حق اور باطل، صحیح اور غلط کا امتیاز ان کی عین سرشت میں ودیعت کیا جاتا ہے، اور فطرۃً وہ صحیح سوچتے ہیں، صحیح بولتے ہیں اور صحیح عمل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت یعقوب کو دیکھیے۔ حضرت یوسف کا خواب سنتے ہی ان کے دل میں کھٹک پیدا ہو جاتی ہے کہ اس بچے کو اس کے بھائی جینے نہ دیں گے۔ برادران یوسف ان کو کھیل کے لیے لیجانا چاہتے ہیں تو حضرت یعقوب نہ صرف انکی بری نیت کو بھانپ لیتے ہیں بلکہ ان کو ٹھیک وہ بہانہ بھی معلوم ہو جاتا ہے جو بعد میں وہ بنانے والے تھے فرماتے ہیں۔ وَ اَخَافُ اَنْ یَّاْکُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ۔ پھر جب یوسف کے بھائی خون بھرا ہوا کرتا لا کر دکھاتے ہیں تو حضرت یعقوب اس کو دیکھ کر فرماتے ہیں بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا۔ اسی طرح جب برادران یوسف مصر سے واپس آکر کہتے ہیں کہ آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے، اور یقین دلانے کے لیے یہاں تک عرض کرتے ہیں کہ اس بستی کے لوگوں سے تو پوچھ لیجیے جہاں سے ہم آ رہے ہیں، تو حضرت یعقوب پھر وہی جواب دیتے ہیں کہ یہ تمہارے نفس کا دھوکہ ہے۔ اس کے بعد بیٹوں کو پھر مصر بھیجتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اِذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ وَ اَخِیْهِ۔

بعد جب ان کے بیٹے حضرت یوسف کا قمیص لے کر مصر سے چلتے ہیں تو ان کو دور ہی سے حضرت یوسف کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی نفسی و روحانی قوتیں کس قدر غیر معمولی ہوتی ہیں صرف حضرت یعقوب ہی کی خصوصیت نہیں، تمام انبیاء کا یہی حال ہے۔ حضرت یحییٰ کے متعلق ارشاد ہے۔

وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً (۱۹ : ۱)	ہم نے بچپن ہی میں اس کو قوت فیصلہ اور رحم دلی اور پاک طینتی اپنی طرف سے عطا کی۔

حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے گہوارے میں کہلوایا جاتا ہے کہ :۔

وَجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا۔ (۱۹ : ۲)۔	اور اللہ نے مجھ کو برکت والا بنایا، جہاں بھی میں ہوں اور اس نے مجھ کو وصیت کی کہ جب تک جیوں نماز پڑھوں اور زکوٰۃ دوں اور اس نے مجھکو اپنی ماں کا خدمت گذار بنایا اور مجھکو جبار اور شقی نہیں بنایا۔

نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا:۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۶۸ : ۱)	اور تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔

یہ سب ان جبلی اور فطری کمالات کی طرف اشارات ہیں جن کو لے کر انبیاء علیہم السلام پیدا ہوتے ہیں۔ پھر حق تعالیٰ ان کی انہی فطری استعدادات کو ترقی دیکر فعلیت کی طرف لے جاتا ہے یہاں تک کہ ان کو وہ چیز عطا کرتا ہے جس کو قرآن میں علم اور حکم (قوت فیصلہ) اور ہدایت اور بینہ وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت نوح اپنی قوم سے کہتے ہیں:۔

وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۷ : ۸)	میں خدا کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملکوت سماوات وارض کا مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے (۶ : ۹)

اور جب وہ اس مشاہدہ سے علم یقین لے کر پلٹتے ہیں تو اپنے باپ سے کہتے ہیں۔

يٰٓاَبَتِ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا (۱۹: ۳)	اے باپ میرے پاس وہ علم آیا ہے جو تیرے پاس نہیں ہے لہذا میری پیروی کر میں تجھے سیدھا راستہ بتاؤں گا۔

حضرت یعقوب کے متعلق ارشاد ہے۔

وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔(۱۲: ۸) ۔	اور یقیناً وہ علم رکھتا تھا جو ہم نے اس کو تعلیم کیا تھا مگر اکثر لوگ یہ راز نہیں جانتے ۔

حضرت یوسف کے حق میں فرمایا ۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۲۴	اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا تو ہم نے اس کو دانش اور قوت فیصلہ عطا کی ۔

یہی بات حضرت موسیٰ کے حق میں بھی فرمائی۔ (۲۸ : ۲) یہی حکم اور علم حضرت لوط کو عطا کیا گیا (۲۱ : ۵) اور اسی غیر معمولی علم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی سرفراز ہوئے ۔

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (۴: ۱۷)	اور اللہ نے تیرے اوپر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھے وہ علم دیا جو پہلے تو نہ جانتا تھا۔
قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ (۶: ۷)	کہہ کہ میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح اور روشن رستے پر ہوں ۔
قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (۱۲: ۱۲)	کہہ کہ یہ میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں بصیرت پر ہوں اور وہ بھی جو میرے پیرو ہیں

اس علم اور حکم سے نبی اور عام انسانوں کے درمیان اتنا عظیم تفاوت واقع ہو جاتا ہے جتنا ایک آنکھوں والے اور ایک نابینا کے درمیان ہوتا ہے۔

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَ الْبَصِیْرُ (۶: ۵) ۔ — میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے، کہو اے محمدؐ کیا اندھا اور آنکھوں والا، دونوں برابر ہیں۔

ان آیات میں جس چیز کا ذکر کیا گیا ہے وہ محض کتاب نہیں ہے، بلکہ وہ ایک روشنی ہے جو انبیاء علیہم السلام کے نفس میں پیدا کر دی جاتی ہے۔ اسی لیے اس کا ذکر کتاب سے الگ کیا گیا ہے، اور اسے انبیاء کی صفت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ وہ اس روشنی سے حقائق کا عینی مشاہدہ کرتے ہیں، اسی سے غلط اور صحیح میں امتیاز کرتے ہیں۔ اسی سے معاملات میں فیصلہ کرتے ہیں۔ اور اسی سے ان امور میں نظر کرتے ہیں جو ان کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ علماء اسلام نے اسی چیز کا نام وحی خفی رکھا ہے یعنی وہ اندرونی ہدایت و بصیرت جو ہر وقت ان بزرگوں کو حاصل رہتی ہے، اور جس سے وہ ہر موقع پر کام لیتے ہیں۔ دوسرے لوگ غور و فکر کے بعد بھی جن باتوں کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے، اور جن امور میں حق اور صواب معلوم نہیں کر سکتے ان میں نبی کی نظر اللہ کی دی ہوئی روشنی اور بصیرت کے زور سے آن واحد میں تہ تک پہنچ جاتی ہے۔

اس کے بعد قرآن مجید ہم کو بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو نہ صرف حکمت اور قوت فیصلہ اور غیر معمولی دانش و بینش عطا کی ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ ہمیشہ ان پر خاص نظر رکھتا ہے، غلطیوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے، گمراہیوں سے اُن کو بچاتا ہے خواہ وہ انسانی اثرات کے تحت ہوں یا شیطانی وساوس کے تحت یا خود ان کے اپنے نفس سے پیدا ہوں، حتیٰ کہ اگر وہ مقتضائے بشریت کی بنا پر اجتہاد میں بھی غلطی کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فوراً ان کی اصلاح کر دیتا ہے۔ حضرت یوسف کے قصہ میں دیکھیے۔ قریب تھا کہ عزیز مصر کی بیوی ان کو اپنے جال میں پھانس لے، اللہ تعالیٰ نے اپنی برہان دکھا کر ان کو بدکاری سے روک دیا۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ — اس نے یوسف سے ارادہ بد کر ڈالا، اور وہ بھی اس کی طرف ارادہ کر لیتا

رَبِّهٖ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا ایسا ہوا تاکہ ہم اس کو برائی
اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (۱۲: ۲۴) اور بے حیائی سے پھیر دیں کیونکہ وہ ہمارے ان بندوں میں تھا جنہیں ہم نے اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو جب فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا گیا تو انہیں خوف ہوا کہ کہیں فرعون ان پر زیادتی نہ کرے اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ کچھ خوف نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں اور سب کچھ سن اور دیکھ رہا ہوں (۲۰: ۲) ساحروں کے سانپوں کو دیکھ کر موسیٰ ڈرے تو فوراً اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوئی لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى (۲۰: ۲) یہ خوف بشریت کی بنا پر تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس بشری کمزوری کو اپنی وحی سے دور کیا۔

حضرت نوح بیٹے کو ڈوبتے دیکھ کر چیخ اٹھے رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ یہ بشری کمزوری تھی اللہ نے اسی وقت یہ حقیقت ان پر واضح کر دی کہ وہ تیرے نطفہ سے ہے تو ہوا کرے مگر تیرے "اہل" سے نہیں، کیونکہ عمل غیر صالح ہے بشریت نے محبت پدری کے جوش میں نبی کی نظر سے اس حقیقت کو چھپا دیا تھا کہ حق کے معاملہ میں باپ بیٹا، بھائی کوئی چیز نہیں اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے اسی وقت آنکھوں پر سے پردہ اٹھا دیا، اور حضرت محمد مصطفیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی متعدد مرتبہ ایسے واقعات پیش آچکے ہیں اپنی فطری رحمت و رافت، کفار کو مسلمان بنانے کی حرص، کفار کی تالیف قلب لوگوں کے چھوٹے سے چھوٹے احسان کا بدلہ دینے کی کوشش، منافقین کے دلوں میں ایمان کی روح پھونکنے کی خواہش، اور کبھی کبھی اقتضائے بشریت کی بنا پر جب کبھی آپ سے اجتہادی لغزش ہوئی ہے، وحی جلی سے اس کی اصلاح کی گئی ہے عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى (۸۰: ۱) مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى (۸: ۹) عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (۹: ۶) اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (۱۰: ۱۹) وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا (۹: ۱۱) يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (۶۶: ۱) یہ سب آیات اسی امر کی شہادت دیتی ہیں۔ لوگ ان آیات کو اس امر کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے غلطیاں سرزد ہوتی تھیں اور آپ غلطیوں سے مبرا نہ تھے۔ خصوصاً حضرات اہل قرآن کو تو ان آیات کے ذریعہ سے اللہ کے

رسول کی غلطیاں پکڑنے میں خاص مزا آتا ہے لیکن در اصل یہ آیتیں اس امر کا ثبوت ہیں کہ اپنے نبی کو غلطیوں سے بچانے اور ان کی اصلاح کرنے کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے رکھی تھی۔ ایک جگہ نہیں متعدد جگہ حق تعالیٰ نے یہ بات واضح طور پر بیان کی ہے کہ وہ براہ راست اپنے نبی کی نگرانی کرتا ہے مثلاً فرمایا:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ أَنْ يُّضِلُّوكَ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّونَكَ مِنْ شَيْءٍ وَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (۴ : ۱۷)

اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ تو تم کو راہ راست سے ہٹا دینے کا عزم کر ہی چکا تھا مگر وہ خود اپنے آپ کو بہکانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے اور تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور تم کو وہ علم دیا ہے جو پہلے تم نہ جانتے تھے۔

وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ وَإِذًا لَّاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا (۱۷ : ۸)۔

قریب تھا کہ وہ تمہیں اس بات سے جو ہم نے تم پر وحی کی ہے منحرف کر دیتے تاکہ تم اس کے سوا کچھ اور ہم پر بنا لو اور اس وقت وہ تم کو دوست بنا لیتے اگر ہم تم کو ثابت قدم نہ رکھتے تو کسی قدر تم ان کی طرف جھک ہی جاتے

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ وَّلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنّٰى أَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ آيٰتِهِ۔ (۲۲ : ۷)۔

ہم نے تم سے پہلے جو رسول یا نبی بھیجا ہے اس نے جب کبھی کسی آرزو کی تمنا کی شیطان نے اس کی تمنا میں وسوسہ ڈال دیا مگر اللہ نے اس بات کو جو شیطان نے ڈالی تھی مٹا دیا، پھر اس نے اپنی آیات کو محکم کر دیا۔

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو تمام ان غلطیوں سے بچاتا ہے جو نفسانیت کے اثر، یا شیطانی اغوا یا خود اپنے نفس کی کسی خواہش کی بنا پر اس سے سرزد ہوتی ہے۔

(باقی)

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔ مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں۔ ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتداء میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لیے مضامین اور حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام سے بھیجے جائیں۔ لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن بدر الدین بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

(طابع و ناشر سید ابو الاعلیٰ مودودی) مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن